معارف

جون ۲۰۱۷ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگرممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگرممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۹ ماہ رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۷ء عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر:۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ:۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

دارالمصنّفین نے جو عظیم الشان لٹریچر تیار کیا ہے اس کی اہمیت، مرتبہ اور مقام کا اندازہ علامہ اقبال کے اس اعتراف سے لگایا جاسکتا ہے کہ ’’جب تک دارالمصنّفین کا لٹریچر ہندوستان میں رہے گا اس وقت تک ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا‘‘۔ یہ گراں مایہ لٹریچر تمام تر اردو زبان میں ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ اردو زبان کی آبرو ہے اور اس نے اردو زبان و ادب کو ثروت مند کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم و دانش کا یہ گراں قدر ذخیرہ ان لوگوں کی دسترس سے باہر ہے جو اردو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ پہلے بھی ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں تھی جو اردو سے ناواقف تھے، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ایسے لوگوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے جو اردو سے بیگانگی کی وجہ سے اس حیات بخش لٹریچر سے مستفید نہیں ہوسکتے۔ یہ بجائے خود تشویش کی بات ہے، لیکن یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے۔ عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے تناظر میں اس سے جڑے ہوئے کئی اور پہلو ہیں جو توجہ کے طالب ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا اور بالخصوص ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ اس لٹریچر کی اہمیت بھی باقی رہے اور وہ ان مقاصد کو بھی پورا کرتا رہے جن کے حصول کے لیے وہ تیار کیا گیا تھا تاکہ وقت گذرنے کے ساتھ اس کی معنویت قائم اور باقی رہے۔

جب ہم اس مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں تو اس سے متعلق کئی پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں جو توجہ کے طالب ہیں۔ دارالمصنّفین کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور تاریخ اسلام پر مستشرقین اور دوسرے معاندین کے ذریعہ کیے جانے والے اعتراضات کا نہ صرف نوٹس لیا بلکہ علمی اور تحقیقی سطح پر اس کا تشفی بخش جواب بھی دیا۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ تو ضرور حاصل ہوا کہ اردو داں مسلمانوں کے ذہن و دماغ میں ان اعتراضات کی وجہ سے جو شکوک و شبہات پیدا ہورہے تھے اس کا ایک حد تک اس لٹریچر کے ذریعہ تدارک ہوگیا۔ لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ یہ تحقیقات ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکیں جن کے جواب میں وہ لکھی گئی تھیں یا اردو داں مسلمانوں کے علاوہ جو لوگ ان سے متاثر ہورہے تھے۔ دارالمصنّفین نے تو اپنے مقدور کی حد تک اپنا فرض ادا کردیا اور خوب خوب ادا کیا لیکن اس کے گرامی قدر مصنّفین اور محققین کی یہ گراں مایہ کاوشیں ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکیں جو اس کے اصل مخاطب تھے۔ یہ کام اب بھی باقی ہے۔

ہندوستان میں مسلم عہدِ حکمرانی کے سلسلہ میں خاص طور سے برادران وطن کے ذہن و دماغ میں بہت سی غلط فہمیاں جاگزیں ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے نتیجہ میں ان میں بہت اضافہ ہوا ہے اور اعتراض کے لب و لہجہ میں غیر معمولی حد تک تلخی اور تندی آگئی ہے۔ دارالمصنّفین نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر جو لٹریچر تیار کیا ہے اس میں ایسے بہت سے اعتراضات کا جواب موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ اس تصویر سے یکسر مختلف ہے جو فرقہ پرست مورخین پیش کرتے

ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی فراخ دلانہ مذہبی رواداری کی پالیسی کے زیر اثر ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات جس طرح باہمی میل ملاپ کے ساتھ زندگی گذارتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے اس کا ایک نہایت موثر اور خوبصورت مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب جس کی جھلکیاں اب بھی نظر آجاتی ہیں، اسی روادارانہ ماحول اور باہمی یگانگت کی دین تھی۔ اس کا بھی نہایت خوبصورت پرتو ان کتابوں میں موجود ہے، لیکن یہ قیمتی لٹریچر ان برادران وطن کی دسترس سے باہر ہے جو اس زہریلی مہم کے اصل ہدف ہیں اور بڑی تعداد میں اس سے متاثر ہورہے ہیں۔ فرقہ پرستی کا زہر دھیرے دھیرے معاشرہ کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتا چلا جارہا ہے۔ اس کے مداوا کا کسی حد تک سامان موجود ہے لیکن لوگ اس کے وجود سے بھی واقف نہیں ہیں۔ دارالمصنّفین کے تیار کردہ لٹریچر کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا "اس کی خصوصیت میں نفس مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اور ان سے بھی زیادہ نمایاں قلب و نظر کی وسعت ہے۔ اس مکتب کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں، وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور "قصہ سکندر و دارا" سنانے پر "حکایت مہر و وفا" بیان کرنے کو ترجیح دی ہے"۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مہر و وفا کی اس حکایت کو ان لوگوں تک پہنچایا جائے جن کے نزدیک ہندوستان میں مسلم حکمرانی سکندر و دارا کے قصہ تک محدود ہے اور اس کا نشانِ امتیاز ظلم، جبر، ناانصافی، استحصال اور عیش کوشی رہا ہے۔

ان سب سے بھی شاید زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب خود ہماری اپنی نئی نسل اردو سے بیگانہ ہوتی چلی جارہی ہے۔ دارالمصنّفین نے یہ لٹریچر جن لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تیار کیا تھا وہ خود اس سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں۔ جس طرح افراد کی صحت کے لیے متوازن غذا ضروری ہے اسی طرح معاشرہ کی علمی اور عقلی ترقی کے لیے صحت مند لٹریچر ضروری ہے۔ یہ صحت مند لٹریچر موجود ہے اور کئی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہا ہے لیکن ہندوستان میں ابھرنے والی مسلمانوں کی نئی نسل کا ایک معتد بہ حصہ اس کا ذائقہ بھولتا جارہا ہے۔ جہاں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ نئی نسل کے ان افراد کو اردو سے قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو فکری غذا فراہم کرنے کے لیے تمام ممکن ذرائع استعمال کیے جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی، فکری اور تہذیبی اساس سے کٹ جائیں۔ یہ ایسا سانحہ ہوگا جس کے سنگین نتائج کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ہم نئی نسل کو کس حد تک اپنے مذہب، تہذیب اور تاریخ سے آگاہ رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اس کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔ ایک صدی پہلے برطانوی سامراجی پالیسی کے زیر اثر مسلمان بڑی حد تک اپنے ماضی اور اپنی تاریخ سے کٹ گئے تھے۔ ان کو اپنی تاریخ سے جوڑنے کا کام بنیادی طور پر علامہ شبلی اور ان کے قائم کردہ اس ادارہ نے کیا تھا۔ اب ایک بار پھر وہی خطرہ درپیش ہے اور اس کے تدارک کے لیے ایک بار پھر دارالمصنّفین کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔

دوسری قوموں کے لیے تاریخ ایک علمی دلچسپی کی بات ہوسکتی ہے لیکن مسلمانوں کے لیے اپنی تاریخ سے واقفیت زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ یہ ہمارا حافظہ ہے۔ اگر کوئی فرد اپنے حافظہ سے محروم ہوجائے تو اس کا انجام جاننے کے لیے بہت زیادہ ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی حال اس قوم کا ہوتا ہے جو اپنے ماضی اور تاریخ سے کٹ جائے اور اپنے اجتماعی حافظہ سے محروم ہوجائے۔

یہی وجہ تھی کہ جب چند سال پہلے دارالمصنّفین کی تعمیرِنو کا منصوبہ بنایا گیا تو ابتدا ہی سے اس ضرورت کا احساس پوری طرح موجود تھا۔ چنانچہ ابھی ابتدائی ضروری کاموں سے فراغت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ اس کام کی داغ بیل ڈال دی گئی اور تمام تر دشواریوں اور مشکلات کے باوجود اکیڈمی کی کتابوں کو ہندی اور انگریزی میں منتقل کرنے کا کام شروع کردیا گیا۔ کئی کتابوں کا ترجمہ ہوا اور بعض ترجمے شائع بھی کیے گئے۔ یہ تفصیلات ان صفحا میں آچکی ہیں۔ دارالمصنّفین کو ہندی اور انگریزی کتابوں کی اشاعت کا کوئی تجربہ نہیں تھا چنانچہ جو کتابیں شائع کی گئیں ان کے سلسلہ میں طباعت کا وہ معیار حاصل نہیں کیا جاسکا جس کی ضرورت تھی۔ مزید براں ان کی نکاسی کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں ہوسکا۔ اس کے علاوہ وسائل کی قلت اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں سدِّ راہ بن گئی۔ ان اسباب کی وجہ سے ابتدا ہی سے یہ خواہش تھی کہ اگر اس کی ذمہ داری اس میدان میں کام کرنے والا کوئی اچھا ادارہ لے لیتا تو اس کے بہتر طریقہ پر انجام پانے کی مناسب صورت پیدا ہوجاتی۔ خواہش اور کسی حد تک کوشش کے باوجود اس میں کامیابی نہیں مل سکی تھی۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اب اللہ کے فضل و کرم سے اس کے اسباب مہیا ہوگئے ہیں۔ دہلی کا Pharos Media and Publishing Pvt Ltd اہل علم کے لیے کوئی اجنبی ادارہ نہیں ہے۔ وہ برسوں ہندوستان کا واحد مسلم انگریزی پندرہ روزہ اخبار ''ملی گزٹ'' نہایت کامیابی اور سلیقہ سے شائع کرتا رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ ادارہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں اہم اور حسّاس موضوعات پر گراں قدر مطبوعات بھی شائع کرتا رہا ہے اور اب طباعتی دنیا میں اس کی اپنی ایک شناخت ہے۔ بدقسمتی سے حالات کے جبر کے تحت ''ملی گزٹ'' ایک ایسے وقت میں بند ہوگیا جب اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ تھی۔ یہ ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ایک انگریزی اخبار کی اشاعت ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بہت پرانا خواب تھا لیکن جب وہ نکلا تو اتنی بڑی مسلم قوم اس کو سنبھال نہیں سکی۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر کی ذاتی کاوشیں اور قربانیاں کہاں تک اس کا ساتھ دیتیں۔ اپنی مختصر فرصتِ حیات میں اس اخبار نے جو صحافتی معیار قائم کیا اور جس بے لاگ اور بے خوف انداز میں مسلم مسائل کو پیش کرنے کی روایت قائم کی وہ قابل فخر بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ دارالمصنّفین کا اس ادارہ سے معاہدہ ہوگیا ہے۔ یہ ادارہ اب دارالمصنّفین کی کتابوں کا ترجمہ بھی کرائے گا اور ان کو شائع بھی کرے گا۔ معاہدہ کی شرائط ایسی ہیں جنہیں کوئی نظریاتی ادارہ ہی پیش کرسکتا ہے۔ صرف منافع پر نظر رکھنے والا کوئی ادارہ ایسی شرائط پر کبھی آمادہ نہیں ہوسکتا۔ ہم اسے ایک تجارتی معاہدہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک اہم مشن کی تکمیل کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ یہ دارالمصنّفین کے مشن کی توسیع بھی ہے اور ایک بڑی ملی ذمہ داری کی ادائیگی کی کوشش بھی جو ان دونوں کے اشتراک سے عمل میں آئے گی۔ انشاء اللہ

مقالات

انساب الاشراف میں مکی روایات سیرت کا جائزہ

کلیم صفات اصلاحی

ابوالعباس احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری بغداد کے مشہور و مستند مورخ اور ماہر انساب و سیر ہیں، تیسری صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے، دمشق میں سماع حدیث کیا، عراق میں محمد بن سعد المدائنی اور مصعب الزبیر سے کسب فیض کیا، خلیفہ المتوکل کے مصاحب و ندیم رہے، متعدد موضوعات پر نہایت جامع و پر مغز کتابیں تصنیف کیں، صرف دو کتابیں فتوح البلدان اور انساب الاشراف (۱۳ جلدیں) دست برد زمانہ سے بچ سکیں، موخر الذکر ہمارے اس مقالہ کا موضوع ہے، ۲۷۹ھ میں انتقال کیا۔(۱)

علم انساب میں بلاذری کا مقام و مرتبہ بڑی عظمت کا حامل ہے، اس فن میں مہارت و دسترس کا ثبوت ان کی زیر نظر کتاب ہے، اس کے بعض اجزا شلوسنگر اور گوٹین نے بیت المقدس سے ۱۹۳۶ء۔۱۹۳۸ء میں شائع کیے(۲)۔بیس برس بعد مشہور عالم محقق و سیرت نگار ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کی پہلی جلد بہترین تحقیق و مراجعت اور قیمتی حواشی کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں دار المعارف مصر سے شائع کی، شروع میں ۹ صفحوں پر مشتمل ڈاکٹر صاحب کا پر مغز مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے انساب الاشراف کے دستیاب نسخوں کی تفصیل درج کی ہے اور جن مصادر و مآخذ سے اس نسخہ کا موازنہ کیا ہے، اس کی فہرست بھی دی اور حواشی تحریر کرتے وقت جن رموز و اشارات کا استعمال کیا ہے، اس کی وضاحت بھی کردی ہے، صفحہ ۱۴ سے ۵۳ تک بلاذری کے سوانح اور انساب الاشراف کی قدر و قیمت پر استاذ عبدالستار فراج کی فاضلانہ و محققانہ گفتگو ہے، اس پہلی جلد کی اشاعت کے تقریباً ۲۷ برس بعد

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر سہیل زکار اور ڈاکٹر ریاض زرکلی کی تحقیق ومراجعت کے ساتھ مکتب البحوث والدراسات کے زیر نگرانی دارالفکر والنشر والتوزیع بیروت لبنان سے ۱۳ جلدوں میں اس کی اشاعت عمل میں آئی، اس کی تیاری میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے محقق ایڈیشن کو بطور خاص پیش نظر رکھا گیا، دارالمصنّفین میں جدید محقق ایڈیشن نہیں ہے، اس لیے ہمارے اس مقالہ کی بنیاد ڈاکٹر حمید اللہ کا شائع کردہ نسخہ ہے۔

موضوع اور اسلوب: بنیادی طور پر انساب الاشراف علم الانساب پر مشتمل کتاب ہے، انساب کے متعلق عربوں کی اس جامع تاریخ کی ترتیب ان کے نامور خاندانوں پر رکھی گئی ہے، بنو ہاشم کے ذکر میں سیرت نبویؐ کے بیشتر گوشوں پر مبنی روایتیں موجود ہیں، اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ''اس کی ترتیب انساب وار کی گئی ہے اور اس کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالاتِ زندگی سے ہوتا ہے جو صحیح نہیں''۔

بلاذری نے کتاب کا آغاز حضرت نوحؑ کے نسب سے اس طرح کیا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت آدم علیہ السلام سے ملا دیا ہے (ص ۳) استاذ عبدالستار فرّاج اپنے دیباچہ میں کتاب کے موضوع اور اس کے اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''کتاب کا آغاز حضرت نوحؑ کے نسب سے کیا ہے، پھر عربوں کے متعلق گفتگو ہے، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب میں اصل جد عدنان کا ذکر کرتے کرتے نیچے آپؐ کے الگ الگ دادؤں تک پہنچ گئے ہیں اور پھر ان کی آل واولاد کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے ص ۱۴۱ میں آپؐ کی پیدائش کا ذکر کیا ہے اور آپؐ کی سیرت پر ۲۳۷ صفحے خاص کیے ہیں (ص ۲۵) ''بدأ الکتاب بذکر نسب نوح علیہ السلام ثم تکلم عن العرب حتی وصل فی ص ۱۴۱ المجلد الاول واستغرقت الصفحات فی سیرتہ ۲۳۷ صفحہ''۔

بلاذری کا علم گہرا اور دائرۂ معلومات وسیع ہے، وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب تحقیق ناقدانہ اور محققانہ ہے، روایتوں کی جانچ پڑتال اور تحقیق میں درایت کو خاص اہمیت دینے اور قرآنی آیات کا خوبصورت استعمال ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے، متعدد روایتوں کے آخر میں ''الاول اصح واثبت (ص ۳۵)''، ''ذلک الثبت (ص ۹۲)''، ''الاول قول الکلبی وھو اثبت (ص ۹۳)''، ''من قال غیر ھذا فقط غلط (ص ۱۰۳)'' وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال ان کی اسی ناقدانہ صلاحیت کی جانب اشارہ کرتا ہے، ان سے صحیح قول کے اختیار اور ترجیح، غیر اہم سے

پرہیز اور پھر اپنی رائے کے اظہار کا بلاذری اسلوب کا علم ہوتا ہے۔

جہاں تک بلاذری کی اس مستند کتاب کے مآخذ و مصادر کی بات ہے تو اس سلسلہ میں بلاذری سے کوئی ایسی چیز منسوب نہیں ہے جن سے ان کے مآخذ کی نشاندہی ہو سکے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بلاذری کے عہد اور اس سے بہت بعد تک کتابوں میں مقدموں کے لکھنے کا رواج نہیں تھا، جس میں ان امور کی نشان دہی ہوتی ہے، طبقات ابن سعد، اخبار ابی نواس، ابی ہفان، کتاب الاخبار الطوال دینوری، کتاب الورقہ ابن الجراح، کتاب المعانی الکبیر ابن قتیبہ بھی ان سے خالی ہیں، کتب احادیث میں بخاری، مسند احمد، سنن دارمی، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد سب کی سب مقدمات سے خالی ہیں، صحیح مسلم میں البتہ عمدہ مقدمہ ہے، جس میں مقصد تصنیف اور اصول وضوابط کی نشان دہی کی گئی ہے۔

مآخذ کی وضاحت کے سلسلہ میں آغاز کتاب میں بلاذری نے صرف اس قسم کے الفاظ لکھے ہیں ''قال احمد بن یحیی بن جابر، اخبرنی جماعة من اهل العلم بالکتب قالوا . . . (ص ۳)، قال بعض اهل المدینة (ص ۳)، قالوا . . . یقال روی، قال الواقدی، حدثنی محمد بن سعد، عن الواقدی فی اسناده'' وغیرہ بیشتر روایتوں کی سندیں متصل اور معلومات مستند ہیں، اس کا اندازہ ڈاکٹر حمید اللہ کی دی گئی ان مطبوعہ کتابوں کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جن کو ڈاکٹر صاحب نے اس مخطوطہ کے تصحیح متن کے وقت پیش نظر رکھا تھا، مثلاً ابن البیطار کی کتاب المفردات، ابن حبیب کی کتاب المحبر، امہات النبی، تہذیب التہذیب، مسند ابن حنبل، کتاب المخصص، ابن سیدہ، کتاب المحکم، الاستیعاب، کتاب الانواء، جمہرۃ الانساب، لسان العرب، سیرت ابن ہشام، دیوان ابوالاسود الدویلی و ابوذویب، الرسالۃ العثمانیہ، ابن جاحظ، الروض الانف، طبری، بدائع الصنائع، مروج الذہب، موطا، التنبیہ والاشراف، جداول النسب باللغۃ الالمانیہ، معجم البلدان، کتاب الخراج، یحییٰ بن آدم وغیرہ۔ (۳)

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بیشتر واقعات پر مشتمل معتبر روایتیں بلاذری نے جمع کر دی ہیں، آگے ان روایتوں کو مطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے جن کا تعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ہے، یعنی زمانۂ حمل مبارک میں والد کا انتقال، رضاعت، طفولیت، شق صدر، والدہ کا انتقال، کفالت عبدالمطلب وابوطالب، سفر شام، بحیرا راہب سے ملاقات، وراثت میں ملنے والی اشیاء، فجار میں شرکت، واقعہ حلف الفضول، تجارت کے لیے شام کا

دوبارہ سفر، شادی، تعمیر کعبہ، حجر اسود کا تنازعہ، غار حرا میں عبادت وتحنث، ظہور جبریل، ورقہ بن نوفل سے گفتگو، نزول وحی، وضو اور نماز، اولین مسلمان، بعثت کے وقت عمر نبوی، اعزا واقربا کو دعوت اسلام، دعوت توحید کے لیے صفا پر جانا، آپ کی مخالفت، ابوجہل، ابولہب بن عبدالمطلب، حارث بن قیس سہمی، ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن مخزوم بن یقظہ، تعذیب مسلمین کے واقعات، شعب ابوطالب میں محصوری (ص ۲۳۰) حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات (۲۳۶) سفر طائف (۲۳۷) قبائل کا دورہ (۲۳۷-۲۳۸) انصار کے اسلام کی ابتدا (۲۳۹) بیعت عقبۂ اولیٰ (۲۳۸) بیعت عقبۂ ثانیہ (۲۴۰) اور بیعت کرنے والوں کی تعداد (۲۴۰) واقعۂ معراج نبویؐ (۲۲۵) اور واقعہ ہجرت وغیرہ جیسے اہم واقعات کی تفصیلات موجود ہیں۔

اس مطالعہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کو تین ادوار ''ولادت سے شادی''، ''شادی سے نبوت'' اور ''نبوت سے ہجرت تک'' میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بلاذری نے سیرۃ نبویؐ کے کن نقوش اور کن پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور کن سے صرف نظر کیا ہے، روایتوں کے ضبط میں تفصیل کو زیادہ اہمیت دی ہے یا اختصار وایجاز کو۔ اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ ان روایات میں بہت توازن واعتدال ہے اور بے جا اطناب سے پرہیز اور ایجاز کی جامعیت کو پیش نظر رکھ کر واقعات تحریر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پیدائش سے شادی تک کے اہم اور مشہور واقعات

ولادتِ نبویؐ: بلاذری نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر دو جگہ کیا ہے، ایک جگہ ''ولادۃ النبی علیہ السلام'' کے تحت ہے کہ حمل کے تیسرے دن حضرت آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ اس کے ذریعہ امت کے سردار کی پیدائش ہوگی، اس کا نام احمد ہوگا، چنانچہ جب آپؐ پیدا ہوئے تو آپؐ کو دادا عبدالمطلب کے پاس بھیجا، وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آپؐ کو لے کر کعبہ میں داخل ہوئے، کچھ اشعار پڑھے اور ماں کو واپس کر دیا۔ (۴)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ولادت باسعادت عام الفیل ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ کو ہوئی، نوشیرواں کی تخت نشینی کا چالیسواں سال تھا اور یہ حیرہ (شام) پر نعمان ابن منذر کی حکومت کے تقریباً ۷ سال پیشتر کا واقعہ ہے، آپؐ حمل ہی میں تھے کہ والد ماجد عبداللہ کا انتقال ہو گیا، چھ اور بیس مہینے کی

روایتیں بھی ملتی ہیں لیکن صحیح اول الذکر روایت ہے۔(۵)

روایت میں وقت پیدائش کا ذکر نہیں ہے، البتہ آگے حضرت عبداللہ کے مدینہ سے واپسی پر انتقال کے وقت ان کی ۲۵ یا ۲۸ برس کی عمر، جنازہ میں بھائی زبیر بن عبدالمطلب کی موجودگی اور مکہ میں تدفین اور حضرت آمنہ کے مرثیہ کا ذکر ہے۔(۶)

بلاذری نے اپنے استاذ ابن سعد کی وہ مشہور روایت نہیں نقل کی کہ آپؐ کی ولادت کے وقت حضرت آمنہ کے جسم سے ایک نور نکلا، جس سے ملک شام کے محل روشن ہو گئے۔(۷)

بلاذری نے واقعہ ولادت کی ان روایتوں کو بغیر سند کے نقل کیا ہے، ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن سعد میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن، مہینہ اور سال کے متعلق کوئی اختلاف نہیں، البتہ تعیین کے لیے جو واقعات بطور ثبوت پیش کیے جاتے ہیں، ان میں کسی نے حرب فجار میں آپؐ کی عمر (۸) اور کسی نے واقعہ فیل اور ولادت کے درمیان گزرنے والی راتوں سے (۹) آپؐ کا سال ولادت متعین کرنے کی کوشش کی لیکن بلاذری نے نوشیرواں کی تخت نشینی اور حیرہ پر نعمان بن منذر کی حکومت کی روایتوں کو بنیاد بنا کر آپ کی تاریخ ولادت اور سال کا تعین کیا ہے۔

رضاعت: اصحاب سیر نے اس سلسلے میں عام طور سے لکھا ہے کہ سب سے پہلے آپؐ کو والدہ حضرت آمنہ نے دودھ پلایا اور دو تین روز کے بعد ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے دودھ پلایا (۱۰) بلاذری نے لکھا ہے کہ آنحضورؐ کی ولادت کے بعد رضاعت کے لیے عورت کی تلاش ہوئی تو حلیمہ بن ابی ذؤیبؓ جن کے شوہر کا نام حارث بن عبدالعزیٰ تھا نے آپؐ کو دودھ پلایا "قالوا لما ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التمس له الرضاع فاسترضع له امرأة من بنی سعد... یقال لها حلیمة" (۱۱) پھر رضاعت کے دوران آپؐ کی ان برکات کا ذکر حضرت حلیمہؓ کی زبان سے کیا ہے جن کی تفصیلات بالعموم مصادر سیرت میں پائی جاتی ہیں، ابولہب کی لونڈی کی رضاعت کا ذکر آخر میں کیا ہے لیکن والدہ کی رضاعت کا قطعاً ذکر نہیں ہے (۱۲) ابن اسحاق اور واقدی کے مطابق حضرت حلیمہؓ کے والد کا نام ابوذؤیب عبداللہ بن الحارث ہے لیکن ہشام بن الکلبی نے ان کا نام ابی ذؤیب حارث بن عبداللہ بن شجنہ لکھا ہے، بلاذری نے کلبی کے قول کو اثبت بتایا ہے۔(۱۳)

والدہ کا انتقال: بلاذری لکھتے ہیں کہ آپؐ دو سال کے ہوئے تو عمل شیر خوارگی متروک ہوا لیکن

آپؐ حضرت حلیمہ کے پاس ہی رہے، پانچ برس کے ہوئے تو دادا اور ماں کے حوالہ کر دیا گیا، چھ برس کی عمر تک ماں کے ساتھ رہے، آٹھ برس کی بھی روایت ہے لیکن چھ والی روایت زیادہ صحیح ہے، اس دوران والدہ نے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے مدینہ کا سفر کیا، ساتھ میں عبدالمطلب اور خادمہ ام ایمن بھی تھیں، واپس لوٹ رہی تھیں کہ ابوا میں انتقال کر گئیں اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔(۱۴) بعض بصری علما کے اس خیال کو کہ حضرت آمنہ شعب ابی دب الخزاعی میں دفن ہوئیں غلط بتایا ہے۔(۱۵)

واقعہ شق صدر کا ذکر نہیں: آپؐ بنی سعد یعنی حضرت حلیمہؓ کے پاس ہی تھے، چوتھا یا پانچواں سال تھا کہ شق صدر کا مشہور واقعہ پیش آیا، جس کی تفصیل کتب احادیث مسلم (۱۶) وغیرہ اور کتب سیر ابن اسحاق (۱۷) اور ابن سعد (۱۸) وغیرہ میں موجود ہے کہ آپؐ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، حضرت جبریلؑ آئے اور سینہ چاک کیا، دل نکال کر اسے آب زمزم سے دھویا اور پھر اس کو اس کی جگہ لوٹا دیا (۱۹) لیکن بلاذری نے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

آپؐ کی گم شدگی: عہد طفولیت کے مشہور واقعات میں آپؐ کی گم شدگی کا واقعہ بھی کتب سیر میں موجود ہے، بلاذری نے اس واقعہ کا ذکر سنداً لکھا ہے کہ حضرت حلیمہؓ آپؐ کو لے کر چلیں تو مکہ کے قریب آپؐ گم ہو گئے، ورقہ بن نوفل اور ایک دوسرے قریشی کو آپؐ مل گئے، دونوں آپؐ کو عبدالمطلب کے پاس لے گئے اور کہا کہ اس بچہ کو ہم نے اعلائے مکہ میں حیران و پریشان پایا، ہم نے پوچھا کون ہو؟ جواب دیا کہ میں محمد، عبداللہ بن عبدالمطلب کا بیٹا ہوں، تو ہم اسے آپ کے پاس لے کر آئے ہیں، آگے لکھتے ہیں کہ ''وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی'' میں اسی واقعہ کی جانب اشارہ ہے (۲۰) چنانچہ عبدالمطلب نے آپؐ کو اپنے کندھے پر بٹھا کر خانۂ کعبہ کا طواف کیا اور چند اشعار پڑھے۔

حضرت حلیمہؓ کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حسن سلوک کا تذکرہ بھی مختصر اور جامع انداز میں ہے (۲۱) نیز ثوبیہ کی رضاعت اور ان کے ساتھ آپؐ کے حسن سلوک و اکرام کا تذکرہ ہے۔(۲۲)

عبدالمطلب کی وفات: آپؐ ۸ برس کے تھے کہ دادا عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا، مکہ میں حجون میں ان کی تدفین ہوئی، اس وقت حمزہ ۱۲، اور عباس گیارہ سال کے تھے، وفات کے وقت عبدالمطلب کی عمر ۸۲ اور بعض روایتوں میں ۸۸ برس تھی، واقدی کے بیان کے مطابق ام ایمن بتاتی ہیں کہ عبدالمطلب کی وفات کے وقت ان کی چارپائی کے پاس آپؐ کھڑے رو رہے تھے، اس وقت آپؐ کی عمر ۸ برس

تھی (۲۳) وفات کا وقت قریب آیا تو عبدالمطلب نے اپنے بیٹوں کو جمع کر کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وصیت کی، زبیر اور ابوطالب کے نام قرعہ نکالا گیا تو ابوطالب کے نام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کا قرعہ نکلا، یہ بھی روایت ہے کہ عبدالمطلب کی وصیت کے مطابق آپؐ زبیر بن عبدالمطلب کے زیر کفالت ان کی وفات تک رہے، ان کے بعد ابوطالب کے سایہ پرورش میں آئے، بلاذری نے اس روایت کو عدیم الصحۃ قرار دے کر لکھا ہے کہ یہ روایت غلط ہے، اس لیے کہ زبیر بن عبدالمطلب حلف الفضول کے موقع پر زندہ تھے، اس وقت آپؐ بیس برس سے کچھ زیادہ کے تھے جب کہ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپؐ کو ابوطالب اپنے ساتھ شام تجارت کے لیے لے گئے تھے اور یہ واقعہ عبدالمطلب کی وفات کے پانچ سال بعد کا ہے (۲۴) ''ذلک غلط لان الزبیر شھد حلف الفضول ولرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومئذ نیف وعشرون سنۃ لا ختلاف بین العلماء فی ان شخوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الشام مع ابی طالب بعد موت عبدالمطلب باقل من خمس سنین''۔ اس عبارت سے بلاذری کی درایتی نظر صاف ظاہر ہے۔

وراثت: آپؐ کو اپنے والد سے وراثت میں ایک خادمہ ام ایمن جن کا نام برکہ تھا ملی تھیں جن کو آپؐ نے آزاد کر دیا تھا، پانچ سفید اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ، ایک تلوار اور کچھ چاندی کے سکے بھی وراثت میں ملے تھے، ام ایمن آپؐ کی دیکھ ریکھ کرتی تھیں اور آپؐ انہیں ''امی'' کہہ کر بلاتے تھے، بعض راویوں کا خیال ہے کہ ام ایمن ماں کی طرف سے ملی تھیں لیکن اکثر سیرت نگاروں نے ان کو باپ کی متروکہ کہا ہے۔ (۲۵)

ابوطالب کی آغوش تربیت میں: عبدالمطلب کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم چچا ابوطالب کی آغوش تربیت و کفالت میں آئے، وہ تنگ دست تھے اسی سبب اہل وعیال آسودہ حال نہیں تھے، آنحضورؐ جب ان کے ساتھ دسترخوان پر ہوتے تو ماحضر سب کے لیے کافی ہو جاتا، دن بھر اسی طرح گزارتے صبح کو بئر زمزم کے پاس تشریف لے جاتے، پانی خوب پی لیتے، کھانا پیش کیا جاتا تو فرماتے کہ خواہش نہیں ہے آسودہ ہوں (۲۶) ''عرض علیہ الغذاء فیقول لا اریدہ, انا شبعان''۔

اس روایت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوطالب کی محبت و شفقت کے اور واقعات کو بلاذری نے غالباً اختصار کے پیش نظر نہیں بیان کیا۔

سفر شام اور بحیرا راہب کا واقعہ: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور بحیرا راہب کے واقعہ کی روایت میں بلاذری نے بڑے اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے، انہوں نے صرف یہ لکھا:

> ''جب آپؐ بارہ برس کے ہوئے تو کچھ لوگوں نے ابوطالب کے سامنے تجارت کے لیے سفر شام کی تجویز پیش کی، آپؐ کو ابوطالب سے خصوصی محبت تھی، آپؐ نے بھی ساتھ چلنے کی اجازت طلب کی، ابوطالب نے حفاظت کے پیش نظر انکار کیا تو آپؐ مغموم وملول ہوئے، پھر ابوطالب نے ساتھ لے لیا، وہاں ایک راہب جس کا نام بحیرا تھا، نے دیکھا کہ آپؐ پر بادل کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے، ابوطالب سے پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے، کہا بھتیجا، راہب نے کہا، دیکھ رہے ہو، یہ بادل اس کے ساتھ سایہ کیے ہوئے چل رہا ہے، بخدا یہ وہی نبی ہے جس کے متعلق حضرت عیسیٰؑ نے خوش خبری دی ہے، اس کا زمانہ قریب آ گیا ہے، تمہیں اس کی حفاظت پر خاص توجہ دینی چاہیے، پھر ابوطالب مکہ واپس لوٹ آئے''۔(۲۷)

جنگ فجار اور حلف الفضول میں شرکت: بحیرا راہب کے واقعہ کے بعد عموماً مورخین جیسے ابن ہشام (۲۸) اور ابن سعد (۲۹) اور علامہ شبلی نعمانی (۳۰) اور مصنف الرحیق المختوم (۳۱) نے جنگ فجار اور اس میں آپؐ کی شرکت کا تذکرہ کیا ہے، یہ لڑائی قریش اور قیس کے مابین ہوئی تھی، قریش کے تمام خاندانوں نے اس میں اپنی الگ الگ فوجیں بنا رکھی تھیں، آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے، انہی کی صف میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، اس وقت آپؐ کی عمر ۱۵ برس تھی (۳۲) ابن سعد نے سبب جنگ کے متعلق لکھا ہے کہ نعمان بن منذر نے تجارت کے لیے خوشبوؤں کا سامان بازار عکاظ میں بھیجا تھا، ان تاجروں کو عروہ بن عتبہ نے اپنی پناہ دی تو قبیلہ بن بکر کے براض ابن قیس نے عروہ کو قتل کر ڈالا، لڑائی کا اصل سبب یہی واقعہ تھا (۳۳) چوں کہ یہ لڑائی محترم مہینہ جس میں تصادم عربوں کے نزدیک غیر قانونی تھا پیش آئی، اس لیے اس کو حرب فجار کا نام دیا گیا (۳۴) بلاذری نے اس جنگ کا ذکر یوم نخلہ اور یوم شطمہ کے عنوان سے تفصیل سے کیا ہے اور بعض ایسی باتیں بھی لکھی ہیں، جو دوسرے سوانح نگاروں کے یہاں نہیں ہیں، جیسے نعمان کی برّاض اور عروہ سے گفتگو کا ذکر عموماً اصحاب سیر نے نہیں کیا ہے، بلاذری میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ اس جنگ کا ذکر بلاذری نے بحیرا راہب کے واقعہ کے فوراً بعد کے بجائے کعبہ کی تعمیر نو کی روایت کے بعد کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں شرکت کی تھی اور آپؐ اپنے چچاؤں کو تیر تھماتے تھے،''وینا ولھم النبل'' آگے لکھا ہے کہ امام زہری آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں شرکت کے قائل نہیں، اس لیے کہ اگر آپؐ ان کے ساتھ ہوتے تو قریش غالب آجاتے،''بلغنی عن الزھری انه قال: لم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم معھم ولو کان معھم لظھروا'' (۳۵) اس وقت آپ بیس یا اس سے کچھ متجاوز تھے اور یہ حیرہ پر نعمان بن منذر کی حکمرانی کے تیسرے سال کا واقعہ ہے، جو لوگ اس وقت آپ کی عمر چودہ برس بتاتے ہیں وہ غلط ہیں، آگے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ واقعۂ فیل اور فجار کے درمیان بیس، فجار اور تعمیر کعبہ کے درمیان ۱۵، اور تعمیر کعبہ اور نزول وحی یعنی نبوت کے درمیان ۵ برس کا فاصلہ ہے، وضع حجر اسود کے وقت آپؐ کی عمر ۳۵ برس تھی، جن لوگوں کا خیال اس کے برعکس ہے وہ غلط ہیں (۳۶)''ومن قال غیر ھذا فقط غلط'' واقدی کی اس روایت سے بھی جنگ فجار کے وقت آپ کی عمر بیس برس ہی ثابت ہوتی ہے۔

جنگ فجار کے سبب، اس کی تفصیل اور اس میں آپؐ کی شرکت اور عمر وغیرہ پر بھی بلاذری نے گفتگو کی، لیکن ان کی نقل کردہ روایت میں جنگ فجار کی وجہ تسمیہ، یا عربوں کے محترم مہینوں میں کس مہینہ میں یہ پیش آئی، کی ضروری تفصیل رہ گئی ہے۔

ابن سعد نے ماہ شوال کی صراحت کی ہے اور اس مہینہ کے بعد ذی قعدہ میں حلف الفضول کا واقعہ پیش آیا، جس میں خاندان بنی ہاشم، بنی زہرہ، اسد العزی اور بنی تیم بن مرہ وغیرہ عبداللہ بن جدعان کے گھر اکٹھا ہوئے اور باہم معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، تلاش معاش، غریبوں اور کمزوروں کی خبر گیری اور ان کی مدد اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک ہوگا، اس معاہدہ میں آپ شریک تھے (۳۷) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا یہ مشہور واقعہ انساب الاشراف کی پہلی جلد میں تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا، یہ معاہدہ آپؐ کے نزدیک اس قدر محترم و معزز تھا کہ نبوت کے بعد بھی آپؐ فرماتے تھے''اس معاہدہ کے عوض اگر مجھے سرخ اونٹ بھی کوئی دے تو میں نہ بدلوں اور آج بھی اس کے لیے مجھے کوئی آواز دے تو میں لبیک کہوں گا''۔ (۳۸)

اب شادی سے بعثت تک کے واقعات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

شادی سے بعثت تک کے مشہور واقعات

حضرت خدیجہؓ سے تعلق کی ابتدا: یتیمی کی زندگی کے واقعات کتب احادیث میں ہیں کہ آپؐ نے چند قیراط اجرت پر اہل مکہ کی بکریاں چرائیں (۳۹) چچا کے ساتھ تجارت کا تجربہ آپؐ کو ہو چکا تھا، حضرت خدیجہؓ مکہ کی بااثر اور خوش حال و فارغ البال خاتون تھیں، ان سے تعلق کی ابتدا اور تجارت کے لیے ان کا مال شام لے جانے اور پھر نفع و معاوضہ وغیرہ کی تفصیلات عام کتب سیر میں موجود ہیں، بلاذری نے اس واقعہ کا ذکر بڑے ایجاز سے کیا ہے، لکھتے ہیں کہ آپؐ بیس سے متجاوز ہو چکے تھے کہ ابو طالب نے آپؐ سے کہا کہ اے بھتیجے! خدیجہ بنت خویلد بڑی صاحب ثروت و دولت ہیں اور ان کا کاروبار وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے، انہیں ایک امانت دار، پاکیزہ اوصاف و وفا شعار شخص کی ضرورت ہے، کہو تو میں تمہارے لیے ان سے بات کروں، آپؐ نے فرمایا آپ جیسا چاہیں، چنانچہ ابو طالب نے بات کی تو حضرت خدیجہؓ بہت خوش ہوئیں اور اپنے غلام میسرہ کے ساتھ آپ کو شام بھیج دیا، تجارت سے فارغ ہو کر مکہ واپس لوٹے تو میسرہ نے آپؐ کی امانت و دیانت داری، پاکیزگی اور آپؐ کے متعلق اہل کتاب کے خیالات، حسن معاملہ، کثرت نفع اور آپؐ کے فیوض و برکات جن کا انہوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا تھا، ذکر کیا اور کہا کہ ہم آپؐ کے ساتھ سیر ہو کر کھاتے تھے لیکن کھانا پھر بھی بچ جاتا تھا (۴۰) ان خوبیوں نے حضرت خدیجہؓ کے دل میں جگہ بنائی اور انہوں نے شادی کی پیشکش کر دی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دوسری تمام کتب سیر میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ آپؐ کی ایمان داری اور مکارم اخلاق کی عام شہرت سے متاثر ہو کر حضرت خدیجہؓ نے تجارت کی پیشکش خود کی تھی، جب کہ بلاذری کے مطابق اس کی ابتدا ابو طالب نے کی اور آپؐ کے لیے ان سے بات کی، یہ بات اور ہے کہ بلاذری نے اس روایت کو لفظ ''قالوا'' سے بلا سند لکھا ہے۔

تزویج خدیجہؓ: بلاذری کے مطابق حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ میرے چچا عمرو بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی سے میرے نکاح کی بات کریں، چنانچہ بکری ذبح ہوئی، کھانا تیار ہوا، چچا کو بلا کر آنحضورؐ کے پاس بھیجا، آپؐ حضرت حمزہ و ابو طالب کے ساتھ تشریف لائے، سب

نے کھانا کھایا، پھر حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہؐ سے کہا کہ ابوطالب سے کہیے کہ خطبۂ نکاح پڑھیں، ابوطالب نے عمرو سے اجازت لے کر آپؐ کا نکاح ۱۲/اوقیہ اور ایک نش مہر پر پڑھایا (۴۱) آپؐ ۲۵ اور حضرت خدیجہؓ ۴۰ سال کی تھیں، حضرت خدیجہؓ کی ۴۶، آپؐ کی پچیس، آپؐ کی ۲۳ اور خدیجہؓ کی ۲۸ برس عمر کی روایت بھی ہے لیکن علما کے نزدیک اول الذکر روایت ثابت ہے، حکیم بن حزام کی روایت بھی ہے کہ میری پھوپھی ۴۰ اور آپ پچیس سال کے تھے۔ (۴۲)

بلاذری نے اس واقعہ کے تحت ان افسانوں کو راہ نہیں دی جن سے نکاح نبویؐ کی افضلیت و سادگی مجروح ہوتی ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد نکاح کے وقت زندہ تھے ان کو شراب میں بدمست و مخمور کر کے آنحضورؐ کی شادی دھوکہ سے کرائی گئی، ہوش آیا تو برہم ہوئے اور کہا کہ یہ برابر کا جوڑ انہیں ہے، شادی سے متعلق جو ضروری معلومات تھیں بس ان ہی پر اکتفا کیا ہے۔

اولاد کا تذکرہ: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کی تعداد میں اختلاف ہے، متفق علیہ روایت کے مطابق کل چھ: قاسمؓ، ابراہیمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ، قاسمؓ پہلے صاحب زادے تھے، بلاذری کے مطابق وہ دو سال کے تھے کہ انتقال کر گئے (ص ۳۹۶)، سال پیدائش کا ذکر بلاذری نے نہیں کیا ہے۔ نبوت سے گیارہ برس پہلے ان کی پیدائش کا ذکر سیرت النبیؐ میں موجود ہے، اس لحاظ سے اس وقت آپؐ کی عمر ۲۹ برس ہوتی ہے (۴۳) اس کے بعد حضرت زینبؓ کی پیدائش ہوئی، یہ آنحضورؐ کی بڑی بیٹی تھیں، ابوالعاص سے آپؐ نے ان کی شادی عہد جاہلیت میں کی تھی، جب نبوت ملی تو حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کی صاحبزادیوں نے اسلام قبول کیا (۴۴) روایتوں میں آتا ہے کہ نبوت سے دس برس پہلے ان کی پیدائش ہوئی (۴۵) اسی طرح رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ کے تفصیلی حالات لکھے ہیں مگر ان میں سے کسی کے سال پیدائش کا ذکر نہیں کیا ہے۔

بلاذری نے ابراہیم کے نام سے آپ کے کسی صاحب زادہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ص ۴۰۵ پر لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ کے ایک لڑکا عبداللہ کی پیدائش ہوئی۔ اور جو نبوت ملنے کے بعد پیدا ہوئے اور مکہ ہی میں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ ولدت خدیجة لرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ایضاً عبداللہ وهو الطاهر وهو الطیب، وسمی بهذین الاسمین جمیعا لانه ولد بعد المبعث فی الاسلام وتوفی بمکة۔ (۴۰۵)

تعمیر کعبہ اور وضع حجر اسود کے تنازعہ کا حل: شادی کے بعد اور قبل نبوت کے واقعات میں تعمیر کعبہ اور وضع حجر اسود کا تنازعہ بھی ہے، محققین سیرت نے اس واقعہ کی تفصیلات بیان کی ہیں، بلاذری نے بھی اس واقعہ کو دو صفحہ میں لکھا ہے۔ جیسے سیلاب کے سبب بیت اللہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تو قریش نے اپنی حلال اور پاک کمائی سے اس کی تعمیر نو کا ارادہ کیا، اس وقت آپؐ کی عمر ۳۵ برس تھی، تعمیر کے لیے لوگوں کے الگ الگ حصے بنائے گئے، جب لوگ حجر اسود تک پہنچے تو اس کو اس کی اصل جگہ رکھنے کے سلسلہ میں لوگوں میں اختلاف ہوا، جس نے تصادم کی شکل اختیار کر لی تو ابوامیہ بن مغیرہ نے تجویز پیش کی کہ بنی شیبہ کے دروازے سے جو شخص داخل ہو اس کا فیصلہ سبھی کے لیے قابل تسلیم ہوگا، جب لوگوں نے اس جانب دیکھا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نظر آئے، سب نے بیک زبان کہا اس امین کے فیصلہ پر ہم راضی ہیں، تو آپؐ نے چادر بچھائی اور اس پر حجر اسود رکھ کر قریشی قبائل کے سرداروں سے فرمایا کہ چاروں طرف سے چادر اوپر اٹھائیں، چادر موقع کے برابر آ گئی تو آپؐ نے حجر اسود کو اس کی جگہ نصب فرمادیا، ابی تجراۃ کی والدہ نے کہا کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر اسود نصب کرتے ہوئے دیکھا تو راوی نے پوچھا چادر کس کی تھی، کہا کہ ولید بن مغیرہ کی۔ (۴۶)

یہ روایت پُراز معلومات ہے، لیکن بعض ضروری تفصیل رہ گئی ہے، مثلاً تنازعہ کتنے دنوں تک جاری رہا یا تعمیر کعبہ کے دوران آپؐ نے کس قسم کی خدمت انجام دی، ایک دلچسپ واقعہ بخاری میں اس طرح ہے کہ تعمیر کعبہ کے وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پتھر ڈھوڈھو کر لاتے تھے یہاں تک کہ آپؐ کے شانے چھل گئے تھے، حدیث میں آگے یہ بھی ہے کہ ”فقال العباس للنبیؐ ازارک علی رقبتک فخر الی الارض فطمحت عیناہ الی السماء فقال ارنی ازاری فشدہ علیہ“ (۴۷) ”یعنی عباسؓ نے آنحضورؐ سے کہا کہ اپنا ازار اپنے کندھے پر رکھ لیجیے تاکہ کندھے کی تکلیف زائل ہو جائے، چنانچہ جب آپؐ نے ایسا کیا تو زمین پر گر پڑے، آپؐ کی دونوں آنکھیں آسمان کی جانب تھیں، آپؐ نے فرمایا میرا تہ بند، پھر اس کو اپنی کمر پر مضبوطی سے باندھ لیا۔

لیکن سیرت نگاروں میں ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن سعد اور خود بلاذری نے بھی تعمیر کعبہ کی تفصیلات میں اس قسم کی کوئی روایت نقل نہیں کی ہے، حیرت ہے کہ آپؐ کی زندگی کا ایسا واقعہ مستند محققین سیرت نے کیوں نہیں لکھا، روایت کی صحت و عدم صحت کی بحث اپنی جگہ مگر درایتی نقطۂ نظر سے

۳۵ برس کی عمر میں آپؐ کا اپنے کندھے پر ازار رکھ لینا نا قابل یقین سے باہر معلوم ہوتا ہے۔

تعمیر کعبہ کے ۵ برس بعد آپؐ منصب نبوت سے سرفراز ہوئے، نبوت سے قبل کے جستہ جستہ واقعات میں عرب کے بازار جعاشمہ میں تجارت کے لیے جانے کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے اور حضرت خدیجہؓ نے مقام جرش بھی تجارت کی غرض سے آپؐ کو بھیجا تھا، بلاذری نے اس کو نقل نہیں کیا ہے، اسی طرح مراسم شرک سے اجتناب (یعنی آپؐ کا چڑھاوے کا کھانا کا استعمال نہ کرنا) اور قبل بعثت بت پرستی کی قباحتوں کا بیان اور موحدین جیسے زید بن عمرو بن فضیل سے آپؐ کی ملاقات کا حال بھی نظر نہیں آیا، اسی طرح نبوت سے پہلے کے واقعات میں ایک واقعہ عکاظ میں قس بن ساعدہ کے خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت کا ہے جو ادب کی کتابوں میں موجود ہے (۴۸) مگر بلاذری کی کتاب میں نہیں ہے۔

نبوت سے ہجرت تک

آثار نبوت: اہل سیر واقف ہیں کہ نبوت سے پہلے کی زندگی، دنیاوی تعلقات، تجارتی مشاغل اور اس کی غرض سے سفر، متعدد بچوں کی ذمہ داری، مظلوموں کی حمایت اور حاجت مندوں کی مدد سے عبارت تھی، مگر جب اللہ نے منصب نبوت سے سرفراز کرنا چاہا تو بلاذری کی نقل کردہ روایت کے مطابق آپؐ سے کرامتوں اور معجزات کا ظہور شروع ہوگیا، جب آپؐ گھر سے دور نکلتے اور وادیوں، گھاٹیوں کے درختوں کے پاس سے آپ کا گزر ہوتا تو ''السلام علیک یا رسول اللہ'' کی آواز آتی، آپؐ دائیں بائیں اور پیچھے دیکھتے تو کوئی دکھائی نہ دیتا، حضرت عباسؓ کی وہ مشہور روایت بھی سنداً نقل کی ہے جس کے مطابق حضرت جبریلؑ کو دفعۃً آسمان میں دیکھا جو آپؐ سے کہہ رہے ہیں اے محمد میں جبرئیل ہوں، آپؐ ڈر گئے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے تو حضرت خدیجہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تسلی کے چند الفاظ کہے (۴۹) غار حرا میں تحنث، مراقبہ و ریاضت کی جو تفصیلات بالعموم کتب سیر و احادیث میں پائی جاتی ہیں کہ آپ تنہائی پسند ہوگئے تھے، کھانے پینے کا سامان لے کر حرا میں تشریف لے جاتے اور کئی کئی راتیں وہیں عبادت و ریاضت میں گزار دیتے، ختم ہونے پر واپس آتے تو پھر زادِ راہ لیتے اور مراقبہ میں مصروف ہوجاتے، ایک دن اسی غار میں ناموس اکبر کا ظہور ہوا، یہی باتیں انساب میں بھی ہیں۔ (۵۰)

آغاز وحی: ارباب سیر متفق اللفظ ہیں کہ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نبی بنایا، البتہ وحی کے مہینہ، دن اور تاریخ میں سخت اختلاف ہے، بہت سے لوگوں نے ربیع الاول کا مہینہ لکھا ہے (۵۱) لیکن ابن اسحٰق (۵۲) اور ابن ہشام (۵۳) نے نزول وحی کی ابتدا ماہ رمضان قرار دیا ہے، بلاذری کی نقل کردہ روایت کے مطابق آپؐ پر نزول وحی کا آغاز تو رؤیائے صادقہ کے ذریعہ ہوا اور آپؐ جو خواب دیکھتے، سفیدۂ صبح کی طرح ہوتا، چنانچہ آپؐ خلوت پسند ہوگئے، خلوت گزینی کے لیے حرا تشریف لے جاتے ......، آپؐ غار حرا میں تھے، سنیچر یا اتوار کی شب میں حضرت جبریلؑ آپؐ کے سامنے آئے، ۱۷ رمضان بروز دوشنبہ آپؐ کو پروانۂ رسالت عطا کیا، آپؐ اس وقت چالیس برس کے تھے، ''وھو فی غار حرا وعرض لہ جبریل لیلۃ السبت ولیلۃ الاحد ثم اتاہ بالرسالۃ یوم الاثنین بسبع عشرۃ لیلۃ خلت من شھر رمضان و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن اربعین سنۃ'' (۵۴) ابن ہشام اور ابن اسحاق کی روایتوں میں نزول وحی کا رمضان میں ہونا تو ثابت ہے مگر دن اور تاریخ کا ذکر نہیں ہے، بلاذری کی روایت میں دن اور تاریخ کی وضاحت بھی ہے اور روایت بھی حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، ابن سعد کی روایت میں بھی مہینہ دن اور تاریخ کی یہی تعیین ہے مگر انہوں نے ابن عباسؓ اور انسؓ کے واسطے سے روایت نقل کی ہے۔ (۵۵)

ورقہ بن نوفل کی بشارت: اپنے ساتھ پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کا ذکر آنحضورؐ نے جب حضرت خدیجہؓ سے کیا تو حضرت خدیجہؓ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے ساتھ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس بھیجا جو آسمانی کتابوں کے عالم اور انجیل کے کاتب تھے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ جب میں خلوت گزیں ہوتا ہوں تو مجھے ''یا محمد'' کہہ کے بلایا جاتا ہے مگر کوئی دکھائی نہیں دیتا، انہوں نے کہا کوئی بات نہیں، اب اگر آپؐ کو بلایا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر کر سنیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، چنانچہ آپؐ کے ساتھ جب دوبارہ یہی واقعہ پیش آیا تو ورقہ کی ہدایت کے مطابق آپؐ ٹھہرے رہے اور پوری بات سنی، پھر لوٹ کر ورقہ سے ذکر کیا تو ورقہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ ہی وہ نبی ہیں جن کی اطلاع حضرت عیسیٰ بن مریمؑ نے دی ہے، ہم نے آپؐ کا ذکر کتابوں میں پڑھا ہے، آپؐ نبی مرسل ہیں، آپؐ کو جہاد کا حکم ہوگا، اگر میری زندگی رہی تو آپؐ کے ہمراہ جدو جہد کروں گا (۵۶) بلاذری نے اس روایت کو سنداً نقل کیا ہے۔

آپؐ پر سب سے پہلے کون سی آیات نازل ہوئیں؟: اس مسئلہ میں محدثین اور سیرت نگاروں میں اختلافات کا علم سب کو ہے، کوئی کہتا ہے کہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات آپؐ پر سب سے پہلے نازل ہوئیں اور کسی کے نزدیک سورۃ المدثر کی آیتیں پہلے نازل ہوئیں، بلاذری نے دونوں قسم کی روایتیں مختصراً نقل کی ہیں: یحییٰ ابن کثیر اور امام زہری کی روایت کے مطابق ''یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ'' اور ابن عباسؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ہشام الکلبی، مجاہد وغیرہ سے مروی روایت کے مطابق سورۂ علق کی آیات ہیں (۵۷) بلاذری کی نقل کردہ روایات میں ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ'' کی روایت زیادہ ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی سورۂ علق کی ابتدائی آیات کو ہی مانتے ہیں، لیکن انہوں نے واضح طور پر اپنے انداز کے مطابق لفظ ''ثبت''، ''الذی ھو اثبت'' وغیرہ کے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔

فترۂ وحی: رہی یہ بات کہ ابتدائی وحی کے بعد کتنے دنوں یہ سلسلہ بند رہا، بلاذری نے اس سلسلہ میں کوئی روایت نقل نہیں کی ہے، بہت سے لوگوں نے ڈھائی یا تین سال تک کی روایت نقل کی ہے، جو صحیح نہیں، بلاذری کے استاذ ابن سعد نے فترۂ وحی کی مدت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق چند روز لکھی ہے ''ان رسول اللہ صلعم لما نزل علیہ الوحی بحراء مکث ایاما مالا یری جبریل فحزن حزناً شدیداً'' (۵۸)

طریقۂ وضو ونماز کی تعلیم: حضرت جبریلؑ نے آپؐ کو طریقۂ وضو ونماز بتایا، آپؐ نے اللہ کے اس اعزاز کا ذکر حضرت خدیجہؓ سے کیا اور انہیں بھی وضو کا طریقہ بتایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوقات میں پہلے شخص ہیں جن پر اللہ نے درود وسلام بھیجا (ص ۱۱۱) سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ ایمان لائیں، حضرت ابوبکرؓ اور زید بن حارثہؓ میں کون سب سے پہلے مسلمان ہوا اس کو بھی نقل کیا ہے، حضرت علیؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی (ص ۱۱۲) حضرت علیؓ کی عمر اس وقت ۱۱ برس تھی، بلاذری نے اس روایت کو ثابت کہا ہے۔ (۵۹)

خفیہ وعلانیہ دعوت نبویؐ: بلاذری کے مطابق شروع میں آپؐ نے خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دی، کچھ نوجوانوں نے اس کو قبول کیا، یہاں تک کہ مومنین کی تعداد زیادہ ہوگئی، کفار قریش بھی آپؐ کی باتوں کا انکار نہیں کرتے تھے اور کہتے خاندان عبدالمطلب کا فرد تو آسمان کی باتیں کرتا ہے، یہ سلسلہ چلتا رہا مگر

جب آپؐ نے بت پرستی کی خرابی بیان کی اور کہا کہ اس مذہب پر جن لوگوں کا خاتمہ زندگی ہوا ہے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے تو وہ آپؐ کی جان کے دشمن ہو گئے، آپؐ نے تین برس خفیہ تبلیغ اسلام کی، چوتھے برس اعلان کیا، پھر بھی لوگ اپنے اسلام کو چھپائے رکھتے، بند گھروں یا سنسان گھاٹیوں میں نمازیں پڑھتے اور بعض لوگ بعض کی نگرانی کرتے رہتے (ص ۱۱۶) جب آیت ''وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ'' نازل ہوئی تو آپؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر اہل قریش کو دعوت دی جس کا ذکر تمام کتب سیر میں موجود ہے۔

کفار قریش کی دشمنی اور صحابۂ کرام کی ثابت قدمی کی داستان کا ذکر: حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بعد مکہ میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا، تو کفار قریش کی عداوت دو چند ہوگئی، بلاذری نے ان کے نام اور پھر ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے، چند نام درج ہیں:

''ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث (آنحضورؐ کے ماموں) حارث بن قیس السہمی (جن کے بارے میں آیت اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوٰہُ نازل ہوئی) ولید بن مغیرہ، امیہ، ابی، ابوقیس بن الفاکہ، عاص بن وائل سہمی، نصر بن حارث عبدری و حکم بن العاص وغیرہ یہ سب آپ کے پڑوسی تھے مگر دعوتِ توحید سے نفرت کے سبب آپؐ سے حد درجہ عداوت و دشمنی رکھتے تھے۔(۶۰)

آگے ان کے مفصل حالات اور آنحضورؐ اور آپ کی دعوت کے خلاف ان کی پوری سرگرمیوں پر مشتمل روایات ہیں۔(ص ۱۲۵ تا ۱۵۶)

عمار بن یاسرؓ، خباب بن الارتؓ، صہیب بن سنانؓ، بلال ابن رباحؓ، ابوفکیہؓ اور عامر بن فہیرہؓ وغیرہ کا قریش مذاق اڑاتے تھے، ان کے ساتھ قریشیوں کے مظالم اور ان کمزور اصحاب رسولؐ کی بے مثال ثابت قدمی کی داستان اس طرح نقل کی ہے کہ ان کے اکثر حالات زندگی آ گئے ہیں اور یہ تذکرہ ص ۱۵۶ سے ۱۹۸ تک پھیلا ہوا ہے، ان کے تذکرہ میں جگہ جگہ قرآنی آیات کا خوبصورت استعمال بھی ملتا ہے، مثلاً یہ کہ جب قریشیوں نے آپؐ کے ساتھیوں کے متعلق کہا کہ دیکھیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ان پر احسان کیا ہے اور ان کا یہ حال ہے کہ بے بس و پریشان ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ''اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰکِرِیْنَ وَاِذَا جَاءَکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ'' یا ''اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ'' میں حضرت عمارؓ مراد ہیں (ص ۱۵۹) یا ''وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّھُمْ فِی

الدُّنيا حَسَنَةً''ابوفکیہ،عمار،عامر بن فہیرہ کے باب میں ہے(ص ۱۵۸)اس سلسلہ کی بیشتر روایتیں سند کے ساتھ نقل کی ہیں۔

ابوطالب کی خدمت میں قریش کا جانا: آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر ظلم وجور کے باوجود آپؐ کی دعوتی مہم تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی تو بہت غوروخوض کے بعد قریش کے بعض اشراف چچا ابوطالب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ اپنے بھتیجے کو اس دعوت سے روکیے، یا پھر راستے سے ہٹ جائیں، بہرحال ابوطالب نے سمجھا بجھا کر واپس کیا، اس واقعہ کی تفصیلات ابن سعد میں ہیں، بلاذری میں اس واقعہ سے متعلق مفصل ومختصر کل ۶ روایتیں نقل ہیں لیکن یہ روایتیں انہوں نے اسباب محصوری شعب ابی طالب کے تذکرہ میں نقل کی ہیں، پہلی روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے کہ حضرت ابوطالب نے کہا کہ آپؐ کی قوم نے مجھ سے آپؐ کی شکایت کی ہے، آپؐ ان کے آباواجداد کے دین پر لعن طعن کرنے اور اس کو برا بھلا کہنے سے باز آجائیں، آپؐ آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ بہ خدا اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں تو بھی میں اس سے دست بردار نہ ہوں گا، خواہ اپنے رب کی اطاعت میں اپنی جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے تو ابوطالب نے کہا کہ اے بھتیجے، جایئے، جیسا چاہیں کریں، اب میں آپؐ کو کبھی کسی چیز سے نہیں روکوں گا، پھر اہل قریش نے دیکھا کہ شکایت کے بعد بھی آپؐ اپنے ارادہ وکام پر قائم ہیں تو انہوں نے عبدالمطلب سے مقاطعہ اور آنحضورؐ کا چھپے یا کھلے طور پر قتل کا پروگرام بنایا (ص ۲۲۹۔۲۳۰) اور کہا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے صرف اس جھوٹے اور بے وقوف کے قتل پر ہی صلح ہوسکتی ہے، تو ابوطالب اپنے بھتیجے، بنی ہاشم اور بنی مطلب بن عبدمناف کو لے کر گھاٹی میں چلے گئے۔''عمد ابو طالب الی الشعب بابن اخیه و بنی هاشم و بنی المطلب بن عبدمناف''(ص ۲۳۰)

مہاجرین حبشہ کے نام: مکی واقعات سیرت میں ہجرت حبشہ کو خاص اہمیت حاصل ہے، محققین سیرت نے اس کی تفصیلات فراہم کی ہیں، قریش کے ظلم وتعدی کے بادل جب چھٹتے نہ دکھائی دیے اور مکہ میں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ ہوگیا تو رحمت عالمؐ نے جاں نثاروں کو ہجرت کا مشورہ دیا، بلاذری نے ان مہاجرین کے نام لکھے ہیں اور علم نسب کے ماہر ہونے کی وجہ سے یہ انداز اختیار کیا ہے کہ کس کس خاندان کے کتنے افراد نے ہجرت کی تھی، چنانچہ: خاندان بنوہاشم (ص ۱۹۸)، بنی امیہ

(ص ۱۹۸)، خلفائے بنی عبد شمس (ص ۱۹۹)، بنی نوفل بن عبد مناف (ص ۲۰۱)، بنی اسد بن اسد بن عبدالعزیٰ (ص ۲۰۱)، بنی عبد قصی (ص ۲۰۲)، بنی زہرہ بن کلاب (ص ۲۰۳)، حلفاء بنی زہر (ص ۲۰۴)، بنی تیم بن مرہ (ص ۲۰۵)، بنی مخزوم بن یقظـــہ (ص ۲۰۷)، حلفائے بن مخزوم (ص ۲۱۱)، بنی جمح بن عمرو (ص ۲۱۲)، حلفائے بنی سہم (ص ۲۱۴)، حلفائے بنی سہم بن عدی بن کعب (ص ۲۱۶)، حلفائے بنی عدی (ص ۲۱۷)، حلفائے بنی عامر بن لوئ (ص ۲۱۸)، بنی الحارث بن فہیر (ص ۲۲۳) وغیرہ کے افراد نے ہجرت حبشہ اولیٰ یا جن لوگوں نے ہجرت ثانیہ میں ہجرت کی تھی اس کی وضاحت کی ہے اور بعض مہاجرین حبشہ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا شمار مہاجرین میں غلط ہے اور ثابت نہیں ہے، مثلاً شہید بدر عمرو بن ابی سرح جنھوں نے ہجرت ثانیہ کے وقت حبشہ ہجرت کی تھی، ان کے بھائی وہب بن ابی سرح کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مہاجرین حبشہ میں ہیں، بلاذری نے لکھا ہے "لیس ذلک بثبت" (ص ۲۲۶) اسی طرح خولیٰ بن ابی خولیٰ اور ان کے دونوں بھائیوں ہلال اور عبداللہ کو ہیثم بن عدی نے مہاجرین میں شمار کیا ہے لیکن بلاذری کے مطابق ان کو مہاجرین میں شمار کرنا ثابت نہیں ہے، البتہ خولیٰ اور ان کے بیٹے کی بدر میں شہادت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (ص ۲۱۸) مختصر یہ کہ ہجرت حبشۂ اولیٰ وثانیہ کے متعلق بلاذری کی انساب الاشراف کا یہ باب بڑا اہم ہے، ہجرت اولیٰ رجب سنہ ۵ نبوی میں ہوئی تھی (ص ۲۲۸) لیکن جب مہاجرین کو یہ جھوٹی خبر پہنچی کہ قریش نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا ہے اور وہ مسلمان ہو گئے ہیں تو شوال ۵/ نبوی میں اپنے قریشی رشتہ داروں کے یہاں واپس آنے لگے، حضرت عثمان بن عفانؓ، ابی احیحہ سعید بن العاص، ابوحذیفہ بن عتبہ، امیہ، مصعب بن عمیر، نضر بن الحارث، زبیر بن العوام، زمعہ بن الاسود، عبدالرحمان بن عوف، اسود بن عبد یغوث، عثمان بن مظعون، ولید بن مغیرہ مخزوم کے یہاں مقیم ہوئے (ص ۲۲۷) پھر ہجرت ثانیہ عمل میں آئی۔

محصوری شعب ابی طالب اور حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کا انتقال: حضور اکرمؐ کی مکی زندگی کے سخت ترین اور صبر آزما واقعات میں محصوریِ شعبِ ابی طالب کا واقعہ بھی ہے، ابن سعد نے اس سلسلہ میں ابن عباسؓ سے مروی ایک روایت نقل کی ہے کہ جب قریش کو جعفر اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ نجاشی کے اکرام وحسن سلوک و مدارات کا علم ہوا تو سخت غصہ ہوئے اور آپؐ کے قتل کا منصوبہ

بنانے لگے، بنی ہاشم کے خلاف عہد نامہ لکھا کہ بنی ہاشم سے شادی بیاہ، میل جول اور خرید وفروخت نہ کی جائے گی، عہد نامہ منصور بن عکرمہ العبدری نے لکھا تھا اور یہ کعبہ کے بیچ میں لٹکا دیا گیا تھا، محرم ۷ نبوی کی چاندرات کو شعب ابی طالب میں حضرت ابوطالب مع اہل خاندان محصور ہوئے (۶۱) بلاذری نے اس واقعہ کی تفصیلات ابن سعد، واقدی اور حفص بن عمر کی روایت سے نقل کی ہے، ذیل میں اس کی ضروری باتوں کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے، لکھتے ہیں کہ جب نجاشی نے عمر اور عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی کو واپس کیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور اسلام قبول کیا تو قریش سخت غصہ ہوئے اور سب نے مل کر بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے خلاف ایک عہد نامہ مرتب کیا کہ ان سے نکاح، خرید وفروخت اور میل جول نہ کیا جائے، چنانچہ وہ شعب ابی طالب سے حج کے سوا کسی موسم میں نہ نکلتے تھے، بڑی مشکل کا سامنا تھا، بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، بعض اہل قریش کو یہ مقاطعہ ناگوار تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے عہد نامہ پر دیمک متعین کر دیا جس نے ''باسمک اللہ فاغفر'' کے علاوہ معاہدہ کے تمام الفاظ صاف کر دیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کو اس کی خبر دی تو ابوطالب نے کہا کہ آپؐ کو اس کی اطلاع کیوں کر ہوئی، آپؐ نے فرمایا میرے رب نے دی، ابوطالب نے قریش سے جا کر کہا کہ اپنا عہد نامہ لاؤ جو تم نے ہمارے خلاف لکھا تھا، وہ دوڑے ہوئے گئے اور سوچا کہ شاید ابوطالب ان کے خیال سے متفق ہو گئے ہیں، عہد نامہ دیکھا تو آنحضورؐ کی بات سچ ہوئی، مشرکین مکہ نے کہا کہ آپؐ نے ہمارے ساتھ سحر کیا ہے اور سرنگوں ہو گئے، ابوطالب نے کہا کہ تمہارے ظلم وجور کی حقیقت واضح ہو چکی ہے، ہم لوگ کب تک محصور رہیں گے (۲۳۴) قریش نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اسی سبب سے باہم ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، زہیر بن ابی امیہ، ہشام بن عمرو، عتبہ بن ربیعہ وغیرہ نے عہد نامہ توڑنے پر اتفاق کیا اور شعب ابی طالب کے پاس گئے اور بنی ہاشم کو نکال لائے اور یہ سنہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے، نکلنے کے بعد شروع ذی قعدہ ۱۰ نبوی میں ابوطالب کا انتقال ہو گیا (ص ۲۳۶) مآخذ سیرت میں ابوطالب کی وفات میں اختلاف ہے، بیشتر مآخذ میں ہے کہ شعب ابی طالب سے نکلنے کے چھ ماہ بعد ان کی وفات ہوئی، اس لحاظ سے ان کی وفات کا مہینہ رجب ۱۰ نبوی ہوتا ہے (دیکھیے الرحیق المختوم، ص ۱۶۵) ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے درمیان ایک مہینہ/ ۵ / ۲۵ یا تین

دن فاصلہ کی روایت لکھی ہے، بلاذری کے مطابق حضرت خدیجہؓ کا انتقال ابوطالب سے پہلے ہوا تھا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حجون میں دفن کیا، اس وقت نماز جنازہ کا حکم نہیں ہوا تھا (ص ۲۳۷) آگے ص ۴۰۵ پر لکھتے ہیں کہ بعثت کے دسویں سال ابوطالب کی موت آخر شوال یا شروع ذی قعدہ میں ہوئی، ان کی اور ابوطالب کی وفات کے درمیان ایک مہینہ پانچ یا ۵۵ راتوں کا فرق ہے۔ ’’توفیت خدیجة فی سنة عشرین من المبعث قبل موت ابی طالب شهر و خمسة ایام، یقال خمس و خمسون لیلة‘‘ آگے والی روایت میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ان کی وفات ۱۰؍رمضان ۱۰؍نبوی کو ہوئی اور اس وقت ۶۵ برس کی تھیں ’’و کانت و فاتها لعشر خلون من شهر رمضان بسنة عشر و هی ابنة خمس و ستین سنة‘‘ (ص ۴۰۶)

سفر طائف ۱۰؍نبویؐ: سفر طائف ۱۰؍نبوی میں ہوا، اس کے بارے میں ابن سعد کی ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کے انتقال کے بعد آپؐ گھر ہی میں رہنے لگے اور باہر نکلنا بند کر دیا، ابولہب کو معلوم ہوا تو وہ آپؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ابوطالب کی زندگی میں آپ کا جو مشن تھا اس میں خود کو لگائیے، لات کی قسم جب تک میں زندہ ہوں آپؐ کا کوئی بال بیکا نہ کرے گا (۶۲) ’’فبلغ ذلک ابا لهب فجاءه فقال یا محمد امض لما اردت و ما کنت صانعا اذا کان ابو طالب حیا فاصنعه و اللات لا یوصل الیک حتی اموت‘‘ یہ ابن سعد کی روایت ہے، لیکن بلاذری نے سفر طائف کے ذکر میں یہ روایت نقل نہیں کی، بلکہ براہ راست سفر کا ذکر شروع کر دیا ہے، تسلسل واقعہ کے خیال سے ابن سعد کی روایت کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔

بلاذری لکھتے ہیں کہ ابوطالب کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے غلام زید بن حارثہؓ کے ساتھ طائف تشریف لے گئے تو ثقیف کے لوگوں نے کہا کہ تمہیں تمہارے اپنے شہر اور قوم کے لوگوں نے ناپسند کیا ہے اور تمہاری باتوں کو نہیں مانا ہے، اب ہمارے پاس آئے ہو، ہم تو انکار ورد میں تمہارے اپنوں سے زیادہ سخت ہیں، آپؐ نے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر دعا فرمائی، مایوس ہو کر واپس آرہے تھے کہ خزاعہ کے ایک شخص سے مطعم بن عدی کے پاس کہلا بھیجا کہ میں تمہاری پناہ میں آسکتا ہوں تو انہوں نے آپؐ کو پناہ دی اور آپؐ کو کعبہ تک بحفاظت پہنچایا، آپؐ نے مطعم بن عدی کا شکریہ ادا کیا، آپؐ نے یہ سفر ۱۰ نبوی میں کیا تھا جب شوال کے ختم ہونے میں تین راتیں (۶۳) رہ گئی تھیں۔ (۲۳۷)

تبلیغ اسلام کے لیے قبائل کا دورہ: اس کے بعد تبلیغ اسلام کے لیے آپؐ کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے بلاذری نے لکھا ہے کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہؐ کا معمول تھا کہ حج کے موسم میں آپؐ مکہ آنے والے قبائل کو دعوت توحید دیتے تھے اور آپؐ کو تیز وتند حملوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، آپؐ قبائل کے پاس جاتے اور ان کو دعوت دیتے تو ابولہب لوگوں کو اس سے منع کرتا، یہاں تک کہ قبائل عرب میں بنی حنیفہ، بنی عامر، کندہ، کلب وغیرہ میں سے کسی نے بھی آپؐ کی دعوت قبول نہیں کی۔ (ص ۲۳۸)

انصار کے اسلام کی ابتدا سنہ ۱۰ر نبوی: انصاریوں کے ابتدائی قبول اسلام سے متعلق بھی متعدد روایتیں ہیں، بلاذری نے بلا سند لفظ ''قالوا'' سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ موسم حج میں ہر سال کی طرح اس سال بھی آپؐ قبائل کو دعوت دینے کے لیے تشریف لے گئے، آپؐ کی ملاقات قبیلۂ خزرج کے کچھ لوگوں سے ہوئی، آپؐ نے ان کو اسلام کی طرف بلایا اور ان کے سامنے قرآن کی کچھ آیتیں تلاوت فرمائیں، انہوں نے آپؐ کی دعوت اور آپؐ کے اوصاف کے بارے میں یہودیوں سے سن رکھا تھا، یہ چھ افراد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ (ص ۲۳۹)

بیعت عقبۂ اولیٰ ۱۱ر نبویؐ: آیندہ سال (۱۱ نبویؐ میں) بارہ افراد نے آپؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اسلام کی بنیادی باتوں پر بیعت کی، یہی بیعت عقبۂ اولیٰ ہے، ان کی نشان دہی بلاذری نے کی ہے، ان کی روایت کے مطابق نجار اسعد (۱) عوف (۲) معوذ (۳) (عفرا کے دونوں بیٹے) بنی زریق سے ذکوان بن عبد قیس (۴) رافع بن مالک، قوافل سے عبادہ بن صامت، ابوعبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ (۷) بنی عمرو بن عوف سے عباس بن عبادہ بن نضلہ، بنی سلمہ سے عقبہ بن عامر بن ناجی، قطبہ بن عامر (۱۰)، اوس سے دو شخص ابوالہیثم بن التیہان اشہلی، عویم بن ساعدہ نے اس بات پر بیعت کی کہ ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے، چوری، زنا اور قتل اولاد سے پرہیز کریں گے، جان بوجھ کر افترا پردازی و بہتان طرازی نہ کریں گے اور بھلی باتوں پر عمل کریں گے، اگر اس معاہدہ پر پورے اترے تو جنت واجب ہوگی (۲۳۹) یہ لوگ مدینہ واپس گئے اور قوم کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، یہاں تک کہ ان میں اسلام پھیلا تو انہوں نے آنحضورؐ کو لکھا کہ دین وقرآن کی تعلیم کے لیے کسی کو مدینہ بھیجیں، چنانچہ آپؐ نے مصعب بن عمیر کو بھیجا، وہ اسعد بن زرارہ کے پاس اترے، ان کو نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مصعب کے پہنچنے سے پہلے انہیں نماز پڑھنا آچکا تھا، یہ بھی روایت ہے

کہ حضرت مصعب کو آپؐ نے بیعت عقبۂ ثانیہ کے بعد بھیجا تھا، آنحضورؐ کے پہنچنے تک وہ وہیں رہے، یہ بھی ہے کہ وہ واپس آ گئے تھے اور ہجرت مدینہ میں آپؐ کے ساتھ مصعب بن عمیر بھی تھے۔(ص ۲۴۰)

بیعت عقبۂ ثانیہ ۱۲/ نبوی: اگلے سال (یعنی ۱۲ نبوی میں) حج کا زمانہ قریب آیا تو حج اور عقبہ میں پہنچنے کے لیے اہل مدینہ نے باہم ایک دوسرے سے وعدہ لیا،، بیعت کی ذمہ داری آپؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سپرد تھی، ان کی تعداد ۷۰ تھی، رسول اللہؐ نے ان میں بارہ اشخاص کو نقیب اور کفیل منتخب فرمایا، بلاذری کی اس روایت میں وضاحت نہیں ہے کہ عباس اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے کہ نہیں اور نہ ہی انھوں نے اس موقع پر انصاریوں سے ان کے خطاب ہی کا ذکر کیا ہے، بس ستر اشخاص کے مختصر حالات یعنی ان کا تعلق کس قبیلہ سے تھا؟ ان کا اصل نام کیا تھا؟ کب شہادت پائی وغیرہ۔ ذیل میں صرف ان خانوادوں کا ذکر کیا جاتا ہے جس کی نشاندہی بلاذری نے کی ہے، اشخاص کے نام بخوف طوالت قلم انداز کیے جاتے ہیں۔

قبیلۂ اوس بن حارث کے (۲۱)، قبیلۂ بنی الحارث بنی خزرج کے (۷)، بنی زریق بن عبد بن حارثہ کے (۷)، بنی سلمہ بن سعد بن علی کے (۳۲ ان میں دو عورتیں)، بنی عوف بن الخزرج کے (۵)، افراد نے بیعت عقبۂ ثانیہ میں شرکت کی تھی، ام عمار نسیبہ بن کعب اور ام منیع بنت عمر بن عدی کو اگر اس فہرست سے الگ کریں تو مردوں کی تعداد ستر ہوتی ہے، (۶۴) یہ بارہ نقبا میں تین اوس کے اسید بن حضیر (۱)، ابوالہیثم مالک بن التیہان (۲)، سعد بن خثیمہ (۳)، ۹ خزرج کے ابوامامہ اسعد بن زرارہ، رافع بن مالک الزرقی، سعد بن عبادہ، منذر بن عمر، براء بن معرور، سعد بن الربیع، عبداللہ بن رواحہ، عبادہ بن صامت، عبداللہ بن عمرو (ص ۲۵۲) اور لکھا ہے کہ ان ناموں کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں، ''ولم اثبت من هذه الاسماء الا ما اجتمع عليه اصحابنا۔''

سب سے پہلے براء بن معرورؓ نے بیعت کی (۲۴۶) بیعت کی دفعات کے متعلق لکھا ہے کہ مشکل اور آسان ہر حالت اور تنگی وخوش حالی ہر حال میں مال خرچ کریں گے، ہمیشہ سچ کا ساتھ دیں گے، اللہ کی راہ میں کسی کی ملامت کی پروا نہ کریں گے (ص ۲۵۳) یہ روایت سنداً لکھی ہے۔

واقعۂ معراج: حضور اکرمؐ کی مکی زندگی کے اہم اور مشہور واقعات میں واقعۂ معراج کا بھی شمار ہوتا ہے، یہ واقعہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر علما واصحاب سیر کے درمیان اس کے سال وقوع اور تاریخ میں

اختلاف بھی ہے، کسی نے اس واقعہ کو نبوت کے سال ہی کا واقعہ لکھا ہے، کسی نے نبوت کے پانچ اور کسی نے نبوت کے دسویں سال ۲۷/رجب، کسی نے ہجرت سے سولہ مہینے پہلے یعنی نبوت کے بارہویں سال ماہ رمضان، کسی نے ہجرت سے ایک سال دو ماہ پہلے نبوت کے تیرہویں سال محرم اور کسی نے ہجرت سے ایک سال پیشتر نبوت کے تیرہویں ماہ ربیع الاول کا واقعہ قرار دیا ہے (۶۵) اور اس کی تفصیلات میں بھی عجیب وغریب اطلاعات بہم پہنچائی ہیں، لیکن بلاذری نے اس سلسلے میں کل ۱۰ روایتیں لکھی ہیں جن میں تین روایتیں لفظ ''قالوا'' سے، بقیہ روایتیں بہ سند ہیں، سندوں والی روایتوں میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، ابن عباسؓ، قتادہؓ اور عکرمہؓ سے مروی روایات ہیں جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

ان کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جانے کا واقعہ ہجرت سے ایک سال یا ۱۸ مہینے پہلے کا ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں حجر اسود کے پاس رات کے ابتدائی حصہ میں سورہا تھا کہ جبریلؑ نے اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری، براق آیا اور میں اس پر سوار ہوگیا، آپؐ کی ملاقات حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے ہوئی، آپؐ کے سامنے دودھ اور شراب پیش کی گئی، آپؐ نے دودھ پیا تو جبریلؑ نے کہا فطرت کی جانب ہدایت کی گئی ہے، جب قریش کے سامنے اس کا ذکر آیا تو انہوں نے واقعۂ اسرا کا انکار کیا تو آپؐ نے بیت المقدس اور اس کی علامات بتائیں، اس کے بارے میں قریش نے لوگوں سے پتہ لگایا تو آنحضورؐ کی باتیں سچ ہوئیں، حضرت عائشہؓ، قتادہؓ اور حسنؓ سے مروی روایت کے مطابق آپؐ فرش پر سورہے تھے، آپؐ کی روح کو معراج کرائی گئی، معراج سے پہلے نماز صرف رات میں دو دو رکعتیں ہوتی تھیں، دن اور رات میں پانچ وقت کی نماز معراج میں فرض ہوئی، پھر مقیم کے لیے چار اور مسافر کے لیے دو رکعت اور یہ سلسلہ آنحضورؐ کے مدینہ پہنچنے کے ایک مہینہ بعد تک رہا۔ (ص ۲۵۵-۲۵۷)

واقعۂ معراج کے متعلق بلاذری کی نقل کردہ متعدد روایتوں کی یہ تلخیص ہے، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاذری معراج کو ہجرت سے ایک یا ڈیڑھ سال قبل کا واقعہ مانتے ہیں، زیادہ روایتیں معراج جسمانی کی تائید میں نقل کی ہیں جس سے ان کا معراج جسمانی کا قائل ہونا معلوم ہوتا ہے۔

واقعۂ ہجرت کی تفصیلات: آنحضورؐ کی مکی زندگی کا آخری واقعہ ہجرت ہے، اصحاب سیر وکتب حدیث بخاری وغیرہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، بلاذری نے بھی اس کو بڑی وسعت کے ساتھ لکھا

ہے،جس کی ایک جھلک ذیل میں درج کی جاتی ہے:

’’جب عقبہ میں انصاریوں کی بیعت کا علم قریش کو ہوا تو انہوں نے مسلمانوں پر مظالم میں مزید سختی کر دی ،انہیں ذلیل کیا اور سب وشتم سے نوازنے لگے،مسلمانوں نے رسول اللہؐ سے شکایت کی اور ہجرت کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا مجھے ابھی حکم نہیں ہوا ہے، چند دنوں بعد آپؐ خوش خوش صحابہ کرامؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ جو چاہے ہجرت کرسکتا ہے،چنانچہ انہوں نے خفیہ طور پر ہجرت شروع کر دی۔‘‘

’’براء بن عازب کی روایت ہے مدینہ ہجرت کرنے والے پہلے شخص مصعب بن عمیرؓ اور ابن مکتومؓ ہیں ، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ اولین مہاجرین مقام عقبہ میں فروکش ہوئے (۲۵۸) پھر صحابہ کرامؓ مسلسل ہجرت کرتے رہے، آخر میں رسولؐ اللہ،حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ باقی رہے، یہ سلسلہ طے کرنے میں ایک برس سے زیادہ کا عرصہ صرف ہوا،قریش آنحضورؐ کی ہجرت پر خاص نظر رکھے ہوئے تھے،لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں کہ آپؐ کو مکہ سے نکال دیا جائے،کسی نے مقید کرنے کی رائے دی، بالآخر اتفاق ہوا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک بہادر اور دلیر شخص کو تلوار دی جائے اور سب ایک ساتھ مل کر آپؐ پر حملہ کر دیں ،اس صورت میں تمام قبائل میں خون بہا بٹ جائے گا اور بنوعبد مناف کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اکیلے تمام قریش کا مقابلہ کیسے کریں، جبریلؑ نے آپؐ کو اس کی اطلاع دی اور اس آیت ’’وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ‘‘ میں اسی واقعہ کی جانب اشارہ ہے،آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لیٹنے کا حکم دیا اور حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ان کے گھر کے پچھواڑے سے نکل گئے ، جب اہل قریش گھر میں داخل ہوئے اور نبی سمجھ کر انہیں مارنا چاہا،مگر دیکھا کہ حضرت علیؓ سوئے ہوئے ہیں، پوچھا کہ محمد کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا پتہ نہیں تو انہیں چھوڑ دیا،عبداللہ بن اریقط

نے سواری کا انتظام کیا جس کی اجرت ان کو پہلے مل چکی تھی، آل ابوبکرؓ نے زادراہ تیار کیا تھا، غار ثور کے پاس پہنچے، قریش نے ان کے پیچھے دوافراد جن میں ایک کا نام کرز بن علقمہ تھا لگا دیا، دونوں غار ثور تک پہنچے، کرز نے دیکھا کہ مکڑی نے جال بن دیا ہے، واپس لوٹ گئے، اہل قریش نے آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے خون پر سو اونٹ انعام رکھا تو سراقہ بن جعشم نے پیچھا کیا، قریب ہوا تو اس کے گھوڑے کا پاؤں پھسل گیا، اس نے امان طلب کی اور رسول اللہ کو قریش کے ارادہ کی خبر دی، تین دن غار میں آپؐ رہے اور چوتھے دن ربیع الاول کی ۴ راتیں گزر چکی تھیں، صبح کو نکلے (۲۶۱) اور ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کے دن مدینہ پہنچ گئے (۲۶۳) جہاں لوگ بے صبری سے آپؐ کا انتظار کر رہے تھے، آپؐ کلثوم بن الہدم کے یہاں مقام قبا میں فروکش ہوئے۔" (ص ۲۶۳)

حضور اکرمؐ کی مکی زندگی ہجرت پر ختم ہوتی ہے، ہجرت کی تفصیلات سے بالعموم اہل علم واقف ہیں، حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر چلے جانے کا واقعہ کتب احادیث وسیر میں بڑے تسلسل کے ساتھ ملتا ہے، یہاں سوال یہ ہے کہ جب آپؐ کو علم تھا کہ جان کا خطرہ ہے تو آپؐ نے اپنی جان کے بجائے حضرت علیؓ کی جان کو جوکھم میں کیوں ڈال دیا، کیا ایسی ذات جس نے ہمیشہ دوسروں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کے لیے خود کو پیش کیا ہو وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کر سکتی ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ "یہ سخت خطرہ کا موقع تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہؐ کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرش گل تھا" (۶۶) نہ جانے کیوں علامہ شبلی کی نگاہِ درایت اس مسئلہ پر توقف کے بجائے سرسری گزر گئی۔

حالانکہ ابن سعد نے حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی جو روایت اس واقعہ کے تحت نقل کی ہے اس کی تفصیلات میں ایک جملہ یہ بھی ہے "اتی جبریل رسول اللہ صلی اللہ وسلم فاخبرہ الخبر وامرہ ان لا ینام فی مضجعہ تلک اللیلۃ" (۶۷) اس جملہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ آپؐ کا یہ عمل اشارۂ ربانی کے نتیجہ میں سامنے آیا، ورنہ خود کو بچانے کے لیے کسی کی جان کو خطرہ میں ڈالنا آپؐ کے جذبۂ شفقت وقربانی کے شایانِ شان نہیں۔

نتیجۂ بحث: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۵۳ سالہ مکی زندگی کا احاطہ کسی قدیم ماخذ کے حوالہ سے ہی اتنے کم صفحات میں ممکن نہیں، اسی لیے سیرت کے صرف ان اہم اور مشہور واقعات کو ہی دائرۂ بحث میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جن سے بلاذری نے اپنی اس مستند کتاب میں تعرض کیا ہے، اس کا مقصد یہ پتہ لگانا ہے کہ صاحب انساب الاشراف نے خالص علم الانساب پر مشتمل اپنی اس کتاب میں سیرتی مواد کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے، نسب وسیرت کا یہ حسین امتزاج اس لائق ہے کہ اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، اس میں کوئی مقدمہ تو بلاذری کے قلم سے نہیں ہے، البتہ مطالعہ کے دوران ان کے جس اسلوب و انداز تحقیق ، ایجاز ، ضبط روایت میں حددرجہ احتیاط ، ترجیح ، قرآنی آیات کا استعمال، شعری مواد وغیرہ کی جھلک جن کی جانب مضمون کے ابتدا میں اشارہ کیا جاچکا ہے، بلاذری کے اس سیرتی مواد میں دیکھی جاسکتی ہے، ضرورت ہے کہ انساب الاشراف کے مواد سیرت کو موضوع بنا کر باقاعدہ تحقیق کی جائے، یہ سیرت کی بڑی خدمت ہوگی۔

حواشی

(۱) الفہرست ابن ندیم ص ۱۶۴، مطبوعہ رحمانیہ مصر والاعلام وقاموس تراجم، جزاول، ص ۸۶ ذکر احمد بن کلبی، مطبوعہ عربیہ مصر، ۱۹۲۷ء واردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۴ ص ۲۴ وتاریخ علوم اسلامیہ، ج ۲، ص ۱۰۱، ترجمہ اردو، مطبوعہ ایچ وائی پرنٹرز لاہور ۱۹۹۷ء۔ (۲) تاریخ علوم اسلامیہ، ج ۲، ص ۱۰۱، ترجمہ اردو۔ (۳) دیکھیے انساب الاشراف، ص ۹ تا ۱۱۔ (۴) ایضاً، ص ۸۰۔۸۱۔ (۵) ایضاً، ص ۹۲۔ (۶) ایضاً۔ (۷) طبقات ابن سعد، ج اول، قسم اول، ص ۶۳، مطبعہ بریل لیڈن ۱۳۲۲ھ۔ (۸) سیرت ابن اسحٰق (ترجمہ اردو) تحقیق وتدقیق ڈاکٹر حمیداللہ، ص ۴۲، باب ۴، ۲۰۰۱ء، لیڈن پرنٹرس حیدرآباد۔ (۹) ابن سعد، جزء اول، قسم اول، ص ۶۲۔ (۱۰) سیرۃ النبیؐ، ص ۱۲۱، ایڈیشن ۲۰۰۳ء۔ (۱۱) انساب الاشراف، ص ۹۲۔۹۳۔ (۱۲) ایضاً، ۹۴۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) ایضاً، ص ۹۴۔ (۱۵) ایضاً، ص ۹۵۔ (۱۶) صحیح مسلم باب الاسراء۔ (۱۷) سیرت ابن اسحٰق، ص ۴۴ (ترجمہ اردو)۔ (۱۸) ابن سعد، جزء اول، قسم اول، ص ۷۰، ذکر من ارضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتسمیۃ اخوتہ الخ۔ (۱۹) سیرت ابن اسحاق

اورطبقات ابن سعد وغیرہ میں دوفرشتوں کا ذکر ہے،حضرت جبریلؑ کا نام نہیں ہے،دیکھیے حوالۂ مذکور۔(۲۰)انساب الاشراف،ص۹۵۔(۲۱)ایضاً۔(۲۲)ایضاً،ص۹۶۔(۲۳)ایضاً،ص ۸۴۔(۲۴)ایضاً،ص۸۵۔(۲۵)ایضاً،ص ۹۶۔(۲۶)ایضاً،ص۹۶۔(۲۷)ایضاً،ص۹۶۔۹۷۔(۲۸)ج۱،ص۱۱۶،مطبوعہ محمد علی صبیح،میدان الازہر الشریف۔ (۲۹)جزءاول،قسم اول،ص۸۰۔۸۱۔(۳۰)سیرۃ النبیؐ،جلداول،ص۱۲۸۔(۳۱)الرحیق المختوم،ص۸۹،المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ،لاہور،پاکستان۔(۳۲)ابن ہشام ذکر حرب الفجار،ج۱،ص۱۱۶، فلما بلغ رسول اللہ صلی اللہ اربع عشرۃ سنۃ او خمس عشرۃ سنۃ۔(۳۳)ابن سعد،جلداول،قسم اول،ص۸۰۔(۳۴)ابن ہشام جلد اول،ص۱۱۶،سیرۃ النبیؐ،ج۱،ص۱۲۹۔(۳۵)انساب الاشراف،ص۱۰۳۔(۳۶)ایضاً۔(۳۷)طبقات ابن سعد، جزاول،قسم اول،ص۸۲۔(۳۸)المستدرک للحاکم،ج۲،ص۲۲۰۔(۳۹)صحیح بخاری فی الاجارات باب رعی الغنم فی قیراط،ج۱،ص۳۰۱۔(۴۰)انساب الاشراف،ص۹۷۔(۴۱)ایضاً۔(۴۲)ایضاً۔(۴۳)سیرۃ النبیؐ،جلددوم، ص۲۳۸۔(۴۴)انساب الاشراف،ص۹۹۔(۴۵)سیرۃ النبیؐ،ج دوم،ص۳۳۹۔(۴۶)انساب الاشراف، ص۱۰۰۔(۴۷)صحیح بخاری کتاب المناسک باب فضل مکۃ وبنیانہا،ج۱،ص۲۱۵۔(۴۸)اللآلی الموضوعہ،ص۹۵، مطبوعہ مصر۔(۴۹)انساب الاشراف،ص۱۰۔(۵۰)ایضاً،ص۱۰۵۔(۵۱)الرحیق المختوم،ص۹۷۔(۵۲)سیرۃ ابن اسحاق،باب ۱۵،ص۱۲۹(ترجمہ اردو)۔(۵۳)ابن ہشام،جلداول،ص۱۵۱۔(۵۴)انساب الاشراف،ص ۵۵۔(۵۵)ابن سعد،قسم اول،ص۱۲۹۔(۵۶)انساب الاشراف،ص۱۰۶۔(۵۷)ایضاً،ص۱۰۷۔۱۰۹۔ (۵۸)ابن سعد،جزءاول،قسم اول،ص۱۳۱۔(۵۹)انساب الاشراف ۱۱۴۔(۶۰)ایضاً،ص۱۲۴۔(۶۱)ابن سعد جزءاول،قسم اول،ص۱۳۴۔(۶۲)ایضاً،ص۱۴۱۔(۶۳)ابن سعد نے کچھ راتیں لکھا ہے،متعین تین راتوں کا ذکر ان کے یہاں نہیں ہے،جزءاول،قسم اول،ص۱۴۲۔(۶۴)یہ تفصیلا انساب الاشراف کے ص۲۴۰ تا۲۵۲ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔(۶۵)زادالمعاد،بحث المعراج النبوی،ج۱،ص۳۰۴۔۳۰۵،مطبوعہ مصر،ورحمۃ للعالمین ۱/ ۷۶۔(۶۶)سیرۃ النبیؐ،اول،ص۱۹۳۔(۶۷)ابن سعد،جزواول،قسم اول،ص۱۵۳، ذکر خروج رسول اللہ صلی علیہ وسلم وابی بکر الی المدینۃ۔

اردو کی ادبی تواریخ میں ذکرِ حالی

ڈاکٹر خالد ندیم

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) کا نام اردو زبان وادب کی تاریخ کے رجحان ساز ادیبوں میں شامل ہے۔ وہ اردو کے عظیم شاعروں اور انشا پردازوں کے دور میں پیدا ہوئے۔ مرزا غالب، مصطفی خاں شیفتہ، سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، مرزا داغ، ڈپٹی نذیر احمد، اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی ان کے ہم عصر شعرا و ادبا میں نمایاں تھے، لیکن انہوں نے شعر و نثر اور موضوعات و اسلوب کے اعتبار سے اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ اب جبکہ ان کے مقام و مرتبے اور ان کی علمی و ادبی خدمات کی قدر و قیمت کا تعین ہو چکا ہے اور انہیں بجا طور پر اردو ادب کی نابغہ روزگار شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے، اردو ادب کی تاریخوں میں ان کے بارے میں پیش کی جانے والی آرا کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ حالی کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر تصانیف اور مضامین سے قطع نظر اردو کے ادبی مورخین کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مصنف یا مضمون نگار بالعموم اپنے موضوع سے سروکار رکھتا ہے، جب کہ ادبی مورخ کو موضوع بحث کے متعلق تاریخ کے درمیان رہ کر فیصلہ کرنا ہوتا ہے، چنانچہ مصنف و مورخ کے ہاں کسی شخصیت اور اس کے کارناموں سے متعلق ایک مختلف رویہ سامنے آتا ہے۔

اردو ادب کی اب تک لکھی گئی قابل ذکر طبع زاد تواریخ میں ''تاریخ ادب اردو'' (رام بابو سکسینہ، مترجمہ مرزا محمد عسکری)، ''داستان تاریخ ادب'' (حامد حسن قادری)، ''تاریخ ادبیات اردو'' (ڈاکٹر ابوسعید نورالدین)، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' (ڈاکٹر سلیم اختر)، ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' (سید احتشام حسین)، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' (ڈاکٹر انور سدید)، ''اردو ادب کی تاریخ'' (ڈاکٹر تبسم کاشمیری) اور ''تاریخ ادب اردو'' (ڈاکٹر جمیل جالبی) نمایاں ہیں۔

dr.khalidnadeem@gmail.com (Mob:92-321-4433-155)

مولانا الطاف حسین حالی کی رحلت (۱۹۱۴ء) کے تیرہ برس بعد ۱۹۲۷ء میں رام بابو سکسینہ کی History of Urdu Literature شائع ہوئی، مرزا محمد عسکری نے تاریخ ادب اردو کے نام سے ۱۹۲۹ء میں اس کتاب کا ترجمہ کیا۔ کتاب کا حصہ نظم باب اول سے باب چودہ کو محیط ہے، جبکہ حصہ نثر باب پندرہ سے انیس کو۔ واضح رہے کہ حصہ نظم میں باب چودہ میں حالی پر بحث کی گئی ہے، جبکہ حصہ نثر میں باب سولہ۔

باب چودہ ''اردو شاعری کا جدید رنگ آزاد اور حالی کا زمانہ'' میں جن مباحث پر اظہار خیال کیا ہے، ان میں ''طرز جدید کے پیش رو''، ''انقلاب کا اثر''، ''انگریزی تعلیم کا اثر''، ''جدید رنگ کی خصوصیات''، ''اصنافِ سخن میں جدتیں'' اور ''جدید رنگ کے اثرات'' کے تحت تین طبقات کا تعارف کرایا ہے۔ قدامت پسند طبقہ جو بہر صورت قدیم کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، دوسرا وہ جو بہر صورت قدیم سے کنارہ کشی اختیار کر کے جدید مغربی طرز کو اختیار کرنے پر بضد ہے، جبکہ تیسرا اعتدال پسند طبقہ، جو قدیم روایات کی خصوصیات کو چھوڑے بغیر زمانۂ حال کے مطالبات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ یہ لوگ سکسینہ کے خیال میں زمانہ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں، خود اپنے زمانہ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور زمانہ آیندہ سے مقابلہ کا خوف نہیں کرتے (۱)۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حالی، آزاد، شرر، سرشار، سرور، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، سر محمد اقبال اور حسرت موہانی وغیرہ کا نام لیا ہے۔ اس باب میں سکسینہ نے حالی کے سوانح حالات لکھنے کے بعد ایک پیرا گراف میں ان کی شخصیت کی جملہ خصوصیات اس طرح قلم بند کر دیں کہ گویا حق ادا کر دیا۔ ان کے بقول:

مولانا حالی پرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم تھے۔ دنیوی جاہ وثروت کا خیال ان کے دل میں مطلق نہ تھا۔ ان کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی، جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ کو عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔ قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، مگر اس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے بالکل علاحدہ تھے۔ ان کا مطمح نظر بہت بلند تھا اور لم تقولون ما لا تفعلون کے وہ پورے عامل تھے۔ (۲)

حالی کی شاعری اور اس پر غالب اور شیفتہ کا اثر میں شیفتہ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کئی پتے کی باتیں بیان کی گئی ہیں، لیکن وہ حالی پر غالب کے اثرات کا تجزیہ نہیں کر پائے اور محض یہ کہہ کر رہ

گئے کہ ''مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور انہی کا رنگ ان پر غالب'' تھا۔ وہ یہ نہیں بتا سکے کہ حالی پر غالب کا رنگ کس قدر غالب تھا اور اس کا اظہار کن فکری و فنی پہلوؤں سے اظہار پا سکا؟ شیفتہ کے اثر کو وہ چند جملوں میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''نواب مصطفی خاں شیفتہ کی صحبت میں ان کی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی اور یہیں انہوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا۔ اب ان کو پرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغہ پسند نہیں آتے تھے۔ کسی چیز کا من و عن سیدھے سادے الفاظ میں، جس میں حقیقی جذبات کا بھی کچھ شمول ہو، اب ان کو مرغوب ہونے لگے''۔(۳)

یہاں سکسینہ نے عنوان باندھے بغیر پنجاب بک ڈپو کے لیے انگریزی سے اردو ترجمے پر نظر ثانی کے توسط سے حالی پر مغربی خیالات کے اثر اور کرنیل ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کے تحت منعقدہ مشاعروں میں موضوعاتی نظموں کے ذریعہ آنے والی فکری تبدیلی اور دہلی میں سرسید سے ملاقات کے بعد مسلم نشأۃ ثانیہ کے حوالہ سے ان کی شاعری کے نئے رخ کا ذکر بھی کیا ہے۔

سکسینہ نے ان کی مثنوی، مسدس اور دیوان کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں ان کی چند آرا پیش کی جاتی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی شناسی میں سکسینہ کے خیالات نہایت اہم ہیں:

۱۔ اگر پرانے شعرا کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظمیں بہ لحاظ زبان و تخیل کے کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال نہیں رکھتیں، مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کے راہبر ہیں، جس میں لوگوں کے لیے اب یہ دل نشین ہوتا جاتا ہے کہ علاوہ معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے کچھ اور بھی چیزیں ہیں، جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کرسکتا ہے۔(۴)

۲۔ اس (مسدس) کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک نشان سمجھنا چاہیے۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پراثر اور پُردرد نظموں کے واسطہ مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔(۵)

۳۔ (مرثیۂ غالب سے) معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا رنج و غم بہ مشکل نظم ہو گیا ہے۔ وہ سچے

جذبات اور حقیقی تاثر سے لبریز اور ایک غم زدہ دل کی کیفیات کی سچی تفسیر ہے۔ سادگی، یعنی شائبہ اغراق ومبالغہ سے اس کا معرا ہونا، جو مشرقی شاعری کا جوہر ہے، اس کا نشان امتیاز ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کتاب (مرثیہ) مولانا حالی کی شہرت شاعری کے واسطہ بالکل کافی ہے۔(۶)

۴۔ قصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریقہ سابق کے، مادح کی ساری قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان وشکوہ میں صرف نہیں ہوتی، بلکہ ممدوح کو اس کے اہم فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع پر نصیحت وعبرت کی باتیں بھی اس کو سنائی جاتی ہیں۔(۷)

۵۔ مقدمہ (شعر وشاعری) بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے، مگر کسی قدر سطحی ہے۔(۸)

مذکورہ بالا پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے نکات سے آج کسی کو اختلاف نہیں رہا، جبکہ مقدمہ سے متعلق ان کی رائے بعد میں کلیم الدین احمد کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔

سکسینہ نے حالی کی شاعری پر محض تبصرہ ہی نہیں کیا، بلکہ ان کی اولیات کو بھی تلاش کیا ہے:

۱۔ سب سے پہلے ان ہی نے غزل اور قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا۔(۹) ۲۔ مسدس کی اہمیت عملی طور پر ثابت کی اور مسلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مسدس میں موثر طریقہ سے کیا۔ (۱۰) ۳۔ وطن یعنی مادرِ ہند پر نظمیں لکھیں۔(۱۱) ۴۔ طرز قدیم پر جس میں تکلف وتصنع اور خلافِ واقعہ باتیں جزو غالب تھیں، ضربِ کاری لگائی۔ ہموار خیال کو مدنظر رکھا اور عبارت کو تعقید وتکلف سے پاک کیا۔(۱۲) ۵۔ سیاسی مضامین اپنے کلام میں داخل کیے۔(۱۳)

سکسینہ نے اولیات حالی کے ساتھ ان کی شاعری کے بعض نقائص کی بھی نشان دہی بھی کی۔ کہیں کہیں قواعد عروض کی خلاف ورزی، صحت الفاظ ومحاورات پر عدم توجہی، غیر مانوس انگریزی الفاظ کے استعمال، تخیل کی بلندی وپستی اور بعض اوقات شاعر پر رفارمر اور نیشنلسٹ کے غالب آنے پر انھوں نے اعتراض کیا ہے، لیکن یہ کہہ کر وہ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں کہ باوجود اس کے، ان کے کمالِ شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ جس طرح قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں، اسی طرح مناظر قدرت اور نیچرل شاعری میں بھی ان کا کلام لاجواب ہے(۱۴)۔ البتہ انھوں نے یہ کہہ کر کہ...... ''انھوں نے اردو شاعری کو ایک بڑی حد تک ان مضر اخلاق چیزوں سے پاک وصاف کر دیا، جو اس میں سرایت کیے ہوئے تھیں' اپنے تصور شعر پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔

حالی کی شاعری پر بارہ تیرہ صفحات کے تجزیے کے برعکس حالی کی نثر پر محض تین صفحات مختص کیے گئے۔ یہ حصہ حالی کی سوانح عمری، مقدمہ شعروشاعری اوران کی طرزِتحریر پر نہایت مختصر تبصرے تک محدود ہے۔سوانح عمری سے متعلق سکسینہ کے خیالات ملاحظہ کیجیے:

ا۔(حیات سعدی) سے مولانا نے اردو نثاروں کی صف اول میں جگہ بنائی اوران کی سوانح نگاری کی قابلیت اوراسلوب بیان کا پتا چلا۔(۱۵) ۲۔"یادگارِغالب" تنقیدی کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔تنقید گوکہ اعلیٰ درجہ کی ہے،مگر پھر بھی عقیدت مندی کہیں کہیں جادۂ انصاف سے ہٹا دیتی ہے۔(۱۶) ۳۔یہ(حیاتِ جاوید)ایک مہتم بالشان تصنیف ہے،لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے......مگر ہماری رائے میں اس زمانے کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے،اس وجہ سے کہ سوانح نگاری اورفن تنقید ہمارے یہاں ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔(۱۷)

یوں وہ نثر نگار حالی کے بارے میں اگر مگر کا شکار رہے اور کوئی فیصلہ نہ کرسکے۔بہرحال حالی کے شعرونثر پر سکسینہ کے خیالات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حالی پر ان کی تنقیدی آرا آج بھی غیر متعلق نہیں ہوئیں۔

حامد حسن قادری (۱۸۸۷ء-۱۹۶۴ء) کی "داستان تاریخ اردو" کی تالیف کا آغاز ۱۹۳۸ء میں ہوا،۲۳رستمبر ۱۹۴۱ء کو اس کا دیباچہ لکھا گیا اور نومبر ۱۹۴۱ء میں یہ کتاب آگرہ سے بابو لکشمی نرائن نے شائع کردی۔بعض ترامیم واضافات کے ساتھ ۱۹۵۷ء میں یہ کتاب آگرہ ہی سے دوبارہ چھپی۔ کتاب کا تیسرا اڈیشن ۱۹۶۳ء اور اس کا مکرر اڈیشن ۱۹۸۸ء میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا۔ڈاکٹر گیان چند نے اسے "تاحال اردو نثر نگاروں کی بہترین تاریخ" قرار دیا ہے۔(۱۸)

داستانِ تاریخ اردو ابتدائی دو ابواب (آغازِ اردو سے پہلے اردو زبان،آغازِ اردو) کے بعد نثر کے چھ ادوار کا احاطہ کرتی ہے۔ان نثری ادوار میں سے حالی کا ذکر "نثر کا چھٹا دور (غدر کے بعد)" میں ہوا ہے۔اٹھاسی صفحات پر مشتمل یہ باب بجائے خود ایک کتابچہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حامد حسن قادری نے ابتدا میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی فرمائش پر ۱۹۰۱ء میں لکھی گئی حالی کی آپ بیتی نقل کی ہے،بعد کے حالات کے لیے مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے حالی کے خاکے سے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔

مولانا حالی کی تصانیف نثر و نظم کا مختصر تحقیقی جائزہ لینے کے بعد مصنف نے دو واقعات سے حالی کی قدر دانی کا اندازہ لگایا ہے۔ مسدس مدوجزرِ اسلام کا قبول عام اور ان کی ولادت کا سوسالہ جشن، جس کی صدارت نواب بہاول پور نے کی اور بالخصوص اقبال نے متعدد عوارض میں مبتلا ہونے کے باوجود اس میں شرکت کی۔

''حالی کا طرز تحریر'' میں مصنف نے حالی کے اسلوب کا جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے مختصر سے حصہ میں متعدد کام کے نکات پیش کیے ہیں:

۱-ان کے ہاں سرسید کا جوش، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور شور اور ظرافت نہیں ہے، لیکن قوت بیان اور فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے(۱۹)۔ ۲-حالی نے سرسید کے اسلوب اور زبان کی قدامت کو زبان حال کے مطابق کر دیا ہے(۲۰)۔ ۳-انہوں نے غور و فکر کے ساتھ اردو زبان اور ادب کا جائزہ لے کر، اس کی خامیوں کو دیکھ کر، ضرورتوں کو سمجھ کر، دوسری زبانوں سے مقابلہ کر کے جدید موضوعات کی کتابیں لکھ دیں(۲۱)۔ ۴-مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدت، بیان کی صداقت، زبان کی صحت، اسلوب کی صفائی، دلائل کی قوت، تمثیلات کی برجستگی سب کچھ ہے اور اکثر بے عیب ہے بلکہ بعض جگہ نادر و جدید ہے(۲۲)۔ ۵-ان کی عبارت پڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی، انشا پردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا تاہم ان کی جچی تلی تحریر کا اثر ہوتا ہے (۲۳)۔ ۶-بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے یعنی انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال (۲۴)۔ ۷-حالی جیسے متین اور با اصول ادیب کے لیے اس طرز کو اختیار کرنے کا بجز تقلید سرسید کوئی سبب نہ تھا، لیکن اسی جذبے نے ان کو نہ سوچنے دیا کہ وہ اور ان کا زمانہ ادبیات جدید کے لیے پیشوا اور رہنما ہے۔ ان کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو باقی اور جاری رہنے کے قابل ہو(۲۵)۔

یہاں انہوں نے ''علامہ شبلی کے ذوق صحیح اور نباضیٔ ادب و انشا کی داد'' دی ہے، جنہوں نے بقول ان کے ''اس کجروی کو سمجھ لیا اور اس سے بچ کر چلے''(۲۶)۔

''مولانا حالی پر اعتراضات'' میں حامد حسن نے مولانا کے موضوعاتِ تصنیف اور اسالیب نظم و نثر پر ہونے والی نکتہ چینی کا جائزہ لیا ہے۔ وہ حیات سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید اور مقدمہ شعر و شاعری کو اردو اور حالی کی اولیات قرار دیتے ہیں۔ مقدمہ پر کلیم الدین احمد کے اعتراضات کو مسترد کرتے

ہیں۔ان کی رائے میں یہ تنقید کا نمونہ و مذاق پیدا کرنے کی پہلی کوشش ہے،جس کی نظیر اردو کیا فارسی و عربی میں بھی نہ تھی۔بعض خامیوں کے باوجود ان کے خیال میں اتنی وسعت اور جامعیت کی بھی کوئی کتاب ان پچاس برسوں میں پیدا نہ ہوسکی۔(۲۷)

حالی کی سوانح نگاری پر اعتراضات کے پیش نظر،شبلی نعمانی،مولانا آزاد،مولوی ذکاء اللہ اور مولوی عبدالحلیم شرر کے علمی کارناموں سے موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ’’ایران میں بھی ایسی سیرت سعدی موجود نہ تھی‘‘(۲۸)،چنانچہ حیات سعدی کا ایرانی فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ان کا کہنا درست ہے کہ غالب کے سوانح نگار آج بھی یادگار غالب کے استفاضہ سے بے نیاز نہیں ہیں(۲۹)اور حیاتِ جاوید تو واقعتاً ’’سرسید کے موافق و مخالف دونوں گروہوں کے لیے معلومات کا واحد ذریعہ ہے‘‘۔(۳۰)

اس کا ایک اہم وصف ’’تصانیف حالی کے نمونے‘‘ ہیں،جس میں ’’مجالس النسا‘‘،’’حیاتِ سعدی‘‘،’’مقدمہ شعر وشاعری‘‘،’’یادگار غالب‘‘،’’حیات جاوید‘‘،’’مضامین حالی‘‘،’’مکتوبات حالی‘‘ سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔

بلاشبہ ’’مضامین حالی‘‘ سے تنقیدی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔مولانا کے مجموعۂ مقالات میں ہر نوع کے خیالی،اخلاقی،اصلاحی،مذہبی،تنقیدی مضامین موجود ہیں۔حامد حسن قادری کے خیال میں ان کی روش تحریر یہاں بھی ’’موج نرم خیز‘‘ کی طرح جاری ہے۔ہر مسئلہ کی تحقیق اور ہر مطلب کی تشریح نہایت وسعت نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔(۳۱)

مصنف نے مولانا ذکاء اللہ،مولانا آزاد،شبلی نعمانی اور مولوی سید احمد کی تصانیف پر حالی کے تبصروں کو کشادہ دلی کے ساتھ تنقیدی قرار دیا ہے اور مختلف تنقیدی تحریروں سے مثالیں دیتے ہوئے حالی کی وسعت قلبی کو یوں ثابت کیا ہے کہ حالی ان کے عیوب کو قابل گرفت اور اپنے اختلافات کو لائق ذکر نہیں سمجھتے۔(۳۲)

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی تاریخ ادبیات اردو،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۷ء میں شائع کی لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اس کا تعارف ۵؍مارچ ۱۹۶۹ء کو تحریر کیا،چنانچہ ضروری ہے کہ کتاب اس سے پہلے پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہو۔

یہ کتاب دو جلدوں (اردو نثر،اردو نظم) میں شائع ہوئی۔پانچ ابواب پر مشتمل جلد اول میں

مولانا حالی کا ذکر باب چہارم ''اردو نثر میں اصلاحی اقدام'' میں ملتا ہے۔

ابوسعید لکھتے ہیں کہ تاریخ، تحقیق اور تنقید سب معاملے میں میں نے قابل اعتماد تحقیق اور تنقید رویوں سے فائدہ اٹھایا ہے، البتہ حسب ضرورت جگہ جگہ اپنے خیالات اور رویوں کا اظہار کیا ہے بالخصوص تبصروں کی شکل میں جو کچھ لکھا ہے، وہ سب ہی اپنے خیالات ہیں، چنانچہ زیر بحث حصہ میں حالی کے سوانحی کوائف درج کرنے کے بعد ''ادبی زندگی'' کے ذیل میں تصانیف حالی کے تجزیاتی مطالعہ میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس حصہ میں ابوسعید اول اول کتاب کا تعارف اور پھر تجزیہ پیش کرتے ہیں، ساتھ ساتھ بطور نمونہ اقتباس نقل کرتے ہیں۔ یادگار غالب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غالب پر لکھنے کے لیے مولانا حالی سے بہتر کوئی آدمی نہیں ہوسکتا تھا۔ زمانہ مابعد میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا وہ بہت حد تک حالی کی یادگارِ غالب کا رہینِ منت ہے۔انہوں نے غالب کے کلام پر صرف اسی قدر بحث کی ہے، جس سے اس شاعر عظیم کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کتاب کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔''یادگارِ غالب'' غالب کی بھی یادگار ہے اور حالی کی بھی''۔(۳۳)

ابوسعید کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ''سر سید جیسی بلند پایہ ہستی پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا''، (۳۴) اور چونکہ ''مولانا حالی کو خدا نے بہت صلاحیت دی تھی، انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا''۔ان کے مطابق حالی نے سرسید کی بعض خامیوں کی طرف ہلکے اشارے بھی کیے ہیں لیکن بیشتر جگہ ان خامیوں کی توضیح و تعبیر کر کے اچھے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے (۳۵) تاہم وہ حالی کی نیک نیتی میں شبہہ نہیں کرتے۔

مضامین حالی پر رائے دیتے ہوئے انہوں نے حالی کی شخصیت کے پس منظر میں انہیں سمجھنے کی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں:

> ''مولانا حالی طبعاً ایک صلح پسند اور امن جو انسان تھے، اس لیے ان کے مضامین میں ہر جگہ ایک مفاہمتی انداز پایا جاتا ہے۔تبصرہ ہو یا تنقید، ان کی روش تحریر بہت نرم اور پاکیزہ ہے۔اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں سے نوک جھوک، شکوہ شکایت اور کینہ پروری سے وہ بالکل بے داغ ہیں۔ان کا انداز بڑا شریفانہ ہے، جو ان کی کریم النفسی

کی دلیل ہے۔اس معاملے میں ان کی مثال شاید ہی ملے''۔(۳۶)

حالی کی نثری خدمات کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے جن نکات کی انفرادیت نمایاں کی ہے،وہ درج ذیل ہیں:

۱۔انہوں نے''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر ہمارے شعری سرمایہ کو پاک کرنے کے راستے بتائے(۳۷)۔ ۲۔مولانا حالی پر سرسید کا اثر جتنا زیادہ رہا،ان کے ہم عمروں میں سے کسی پر بھی اتنا نہ تھا۔مولانا حالی کی تمام تحریریں اس کی شاہد ہیں(۳۸)۔ ۳۔مولانا حالی اپنی فطری سادگی اور متانت کی وجہ سے ایک صاحب طرز ادیب قرار نہیں پا سکے،لیکن اس کے باوجود ان کی زبان کا اثر مابعد کے لوگوں پر پڑا ہے(۳۹)۔ ۴۔مولانا حالی کی طرزِ نگارش،تاریخ نگاری یا بیانیہ مضامین کے لیے زیادہ موزوں ہے، جہاں صرف دعا نگاری یا واقعہ نگاری سے زیادہ واسطہ ہوتا ہے۔جذبات و وارداتِ قلبی کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ اس میں لطافت اور حسن بیان کی اتنی اہمیت ہے۔(۴۰)

ابوسعید نورالدین کی درج بالا آرا بحث طلب ہیں۔حالی شروع ہی میں غالب اور پھر شیفتہ سے اثرات لینے کے بعد شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے تھے،بعدازاں انجمن پنجاب کے تحت مشاعروں میں حصہ لینے کی وجہ سے ان کی شاعری کا مغربی دریچہ بھی کھل چکا تھا۔ایسے میں اگر سرسید سے ملاقات یا ان کی طرف سے مسدس لکھنے کی فرمائش نہ کی جاتی تو بھی حالی اپنے فطری ارتقا کے باعث ایک ایسے ادیب اور شاعر کی حیثیت حاصل کر لیتے،جو تاریخ ادب اردو میں نمایاں مقام رکھتا ہو۔

کتاب کی دوسری جلد اردو نظم،باب ششم سے باب دہم کو محیط ہے۔حالی کا تذکرہ باب نہم ''اردو نظم میں اصلاحی اقدام'' میں سرور جہاں آبادی اور مولانا شبلی نعمانی کے درمیان ملتا ہے۔حالاتِ زندگی کے بعد شاعری کے تحت ابتدا سے دہلی میں سرسید سے ہونے والی ملاقات تک ان کے شعری ذوق میں ہونے والی اہم تبدیلی کی مختصر روداد بیان کی ہے۔

ابوسعید نے حالی کی شاعرانہ زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔دور اول میں ابتدا سے لاہور روانگی تک کا زمانہ شامل ہے۔اس دور میں وہ غالب اور شیفتہ کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ان کے خیال میں،غالب نے ان کو اعلیٰ تخیل،ندرتِ فکر اور شوخی گفتار دی اور شیفتہ نے بیان کی سادگی اور سلاست کا ذوق بخشا۔اس کے علاوہ اس زمانے میں پرانے اساتذہ کے کلام کا بھی مطالعہ کرتے

رہے، اس لیے ان کے اس زمانہ کے کلام میں میر، درد اور سعدی کا رنگ جھلکتا ہے۔(۴۱)

دورِ دوم حالی کے قیام لاہور پر مشتمل ہے جو ان کی شاعری کے لیے انقلاب آفریں ثابت ہوا۔ اس سے پہلے وہ اردو شاعری کی روایت کے پابند تھے، لیکن لاہور آکر ان کے بقول ان کی شاعرانہ زندگی میں انقلاب عظیم رونما ہوا۔ انگریزی ادب سے سابقہ پڑا تو انہیں اس میں بہت سے محاسن نظر آئے۔ اس ادب کے مقابلے میں ان کو اپنا ادب فرومایہ اور تہی دامن معلوم ہوا(۴۲)، چنانچہ اس تبدیلی کے زیر اثر انجمن پنجاب کے لیے لکھی جانے والی حالی کی چاروں نظموں سے اقتباسات دینے کے بعد ان سے متعلق سرسید کی رائے درج کی ہے۔

دورِ سوم ۱۸۷۴ء سے سرسید کی وفات (۱۸۹۸ء) تک مشتمل ہے۔ لاہور سے دہلی چلے آنے پر حالی کی ملاقات سرسید سے ہوئی، جنہوں نے انہیں سرسید کی فرمائش پر مسدس مدوجزر اسلام تخلیق کی۔ ابوسعید نے اس نظم کو حالی کی قومی شاعری کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس مقام پر انہوں نے مسدس کے دیباچے، سکینہ کی تاریخ اور سرسید کے ایک خط سے اقتباسات دے کر مسدس کی اہمیت ثابت کی ہے اور بعد میں مثال کے طور پر مسدس کے چھ بند درج کیے ہیں۔

اسی دوران ۱۸۸۳ء میں ان کا دیوان شائع ہوا۔ یہاں غزلیاتِ حالی پر تبصرہ و تجزیہ کرنے کے بجائے ابوسعید تین صفحات پر غزل سے متعلق مقدمہ سے حالی کے بعض خیالات درج کرتے چلے گئے، حالانکہ ان کی شاعری یا غزلوں کی خصوصیات بیان کرنے کی ضرورت تھی، جس کی طرف فاضل مصنف کی توجہ نہیں گئی۔ ہاں، اتنا ضرور کیا کہ آخر میں حالی کی اس دور کی ایک غزل نقل کردی۔

دورِ چہارم پر جو ۱۸۹۸ء سے ان کی وفات (۱۹۱۴ء) کو محیط ہے، مختصر تبصرہ کرکے ابوسعید نے ''چپ کی داد'' اور ایک غزل سے چند اشعار دے کر بات ختم کردی۔ ان کا کہنا ہے کہ اب حالی کی عمر بھی کافی ہوچکی تھی۔ ان میں وہ جوش اور ولولہ تو اب باقی نہ رہا، جو مسدس لکھتے وقت تھا پھر بھی انہوں نے اس دور میں جو چند نظمیں لکھی ہیں، وہ بڑی قابلِ قدر ہیں۔ ان نظموں میں ''تحفۃ الاخوان'' اور ''چپ کی داد'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔(۴۳)

حالی سے متعلق ابوسعید کی تاریخ کا یہ حصہ محض سرسری قرار پاتا ہے، جس میں تنقیدی بصیرت راہ نہیں پاسکی۔ یوں دیکھا جائے تو حصہ نثر میں ابوسعید کوئی نئی بات نہیں کرسکے، بلکہ انہوں نے انہدام

حالی کی کوشش کی، جب کہ حصہ شاعری میں بغیر تجزیے کے ان کی شاعری کے ادوار بیان کر کے خاموشی اختیار کر لی۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں سب سے زیادہ اڈیشن ڈاکٹر سلیم اختر کی ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں اس کا پہلا اڈیشن منصۂ شہود پر آ گیا، زیر نظر کتاب کا اکتیسواں اڈیشن ہے جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔ کتاب کے عنوان میں لفظ مختصر ترین اس اختصار کی طرف توجہ دلا رہا ہے، جو مصنف کے پیش نظر ہے، چنانچہ موضوع زیر بحث سے متعلق بھی کتاب کے محض دو صفحے مختص ہو سکے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اس تاریخ کا تعلق تحقیق سے زیادہ انشا پردازی سے ہے، چنانچہ اس کی تنقیدی، تجزیاتی یا تاثراتی آرا اپنے اسلوب کی بنا پر زیادہ متوجہ کرتی ہیں۔

۱۔ شاعری اور نثر دونوں میں انھوں نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا (۴۴)۔ ۲۔ حالی نے دھیمے اسلوب اور متین لہجہ میں عاشقانہ خیالات کا اظہار کر کے جذبہ کی گرمی کو نرمی میں تبدیل کر دیا (۴۵)۔ ۳۔ حالی نے پہلی مرتبہ ادبی تنقید کو ایک باضابطہ علم قرار دے کر اس کے اصول وضع کیے (۴۶)۔ ۴۔ سرسید ان کے ممدوح بھی تھے اور متنازعہ شخصیت بھی، لیکن حالی نے چند مواقع سے قطع نظر سرسید کا غیر جانب داری سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے (۴۷)۔ ۵۔ انگریزی الفاظ کا بکثرت اور بسا اوقات غلط، بے معنی اور مہمل استعمال اسی احساس کمتری کا غماز ہے، جس کا اس عہد میں قومی سطح پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے (۴۸)۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے یہ بیانات حالی کی شخصیت اور ان کے شعر و ادب کا مکمل احاطہ نہیں کرتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ حالی کو سمجھنے کے لیے بنیادی نکات ضرور پیش کر دیتے ہیں۔ یقیناً دو صفحات میں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی۔

۱۹۸۳ء میں سید احتشام حسین کی ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مولانا حالی کی شخصیت اور فکر و فن پر چھ صفحات وقف کیے گئے ہیں، جو حالی جیسی اہم ادبی شخصیت کے لیے یقیناً ناکافی تھے، لیکن ۳۴۰ صفحات کی اس تاریخ میں اس سے زیادہ کا مطالبہ مناسب بھی نہیں۔ حالی کا تذکرہ کتاب کے دسویں باب نیا شعور اور نیا نثری ادب اور گیارہویں باب نشاۃِ ثانیہ کی اردو شاعری میں ہوا۔ دسویں باب میں دو اَڑھائی اور گیارہویں باب میں چھ صفحات پر حالی کے حالاتِ زندگی، ان کی

شخصیت اور فنکارانہ خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ دونوں مقامات پر حالات زندگی درج کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

ان کی نثری تصانیف پر انھوں نے زیادہ کھل کر بات نہیں کی، بلکہ یہاں سے وہ سرسری گزر گئے ہیں۔ حیات سعدی ان کے خیال میں سوانح نگاری کے نقطہ نظر سے نئے طرز کا پتا دیتی ہے (۴۹) ''یادگارِ غالب'' کو غالب پر پہلی تصنیف قرار دیتے ہیں، جس میں غالب کی سرگزشت حیات کے ساتھ ساتھ غالب فہمی کے نکات بھی سامنے آجاتے ہیں (۵۰) جبکہ حیاتِ جاوید اعتراضات کے باوجود، ان کے نزدیک سرسید کو ایک قومی رہنما اور مفکر کی حیثیت سے پیش کرنے میں ناکام نہیں ہے۔ (۵۱)

انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری کو دور جدید کی ان بنیادی کتابوں میں شمار کیا ہے، جس میں سنجیدہ نثر میں تنقیدی طرزِ فکر کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ (۵۱) وہ سمجھتے ہیں کہ حالی کا تنقیدی نقطہ نظر، اصلاح و اخلاق کے زیر اثر روحِ ادب سے دور جا پڑتا ہے، لیکن عام طور پر ان کا اندازِ نظر سائنٹفک ہے اور اس کا سلسلہ آج کے تنقیدی شعور سے جوڑا جا سکتا ہے۔ (۵۲)

حالی کے شاعرانہ مقام و مرتبہ کے متعلق سید احتشام حسین کی آرا ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ اس عہد کے سب سے بڑے شاعر مولانا حالی تھے اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے ہی نئے ادب کی نیو مضبوط کی۔ (۵۴) ۲۔ وہ میر، غالب اور شیفتہ سے متاثر ہوئے تھے، اسی لیے حالی کی غزلیں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں اور ان کے شعر دل میں تیر کی طرح چبھ جاتے ہیں۔ (۵۵) ۳۔ نئی شاعری سے رشتہ جوڑنے کے بعد انہوں نے غزلوں میں بھی اخلاقی، اصلاحی اور قومی فلاح کا بیان شروع کر دیا۔ (۵۶) ۴۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے صرف حالی کے صاحب دل اور وزن و وقار کا نشان نہیں ملتا، بلکہ اس وقت کے ہندوستان میں اصلاح و ترقی کی جو ولولہ آمیز لہر دوڑ رہی تھی، اس کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ (۵۷) ۵۔ حالی کا شعور بھی دو عملے میں پھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ محب وطن اور وفادار سرکار دونوں ہی بننا چاہتے تھے۔ (۵۸) ۶۔ حالی صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے، ایک بڑے نقاد بھی تھے۔ (۵۹) ۷۔ چونکہ انہوں نے زندگی اور ادب کے رشتے کو سمجھ لیا تھا، اس لیے وہ کبھی محض ''کہنے'' کے لیے شاعری نہیں کرتے تھے۔ (۶۰) ۸۔ وہ نئی شاعری کے پیامبر مانے جاتے ہیں اور اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود ان کی ترقی پسندی آج بھی بے یقینی اور

تذبذب میں مبتلا رہنے والے شاعروں کے لیے خضر راہ ہے۔(۶۱)

ابوسعید نورالدین کے برعکس احتشام حسین حالی کو سرسید کے اس قدر زیر اثر نہیں سمجھتے کہ ایک انفرادی شان اور ایک جداگانہ شخصیت قائم نہ کر سکے (۶۲) بلکہ ان کا کہنا ہے کہ حالی سرسید کے سیاسی اور تعلیمی تصورات سے بہت کچھ متفق تھے، ادبی نقطہ نظر میں بھی انہیں سرسید کی تحریک سے بہت فائدہ پہنچا تھا، لیکن کچھ اپنی ریاضت اور غالب وشیفتہ کی صحبت سے ان کے ادبی کارنامے سرسید کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔(۶۳)

۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر انور سدید کی ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' شائع ہوئی، جبکہ دسواں ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں حالی کا تذکرہ دسویں باب سرسید احمد خان کا عہد میں صفحہ ۲۸۱ سے ۲۸۴ تک ملتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے اس مختصر تجزیہ سے چند نکات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔حالی کی ابتدائی غزلوں میں میر کی دردمندی اور شیفتہ کی عشقیہ شیفتگی کا پرتو نمایاں ہے، لیکن ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھنے کے بعد وہ غزل کو جدید بنانے لگے تو یہ بالکل پھسپھسی ہوگئی۔(۶۴)
۲۔سوانح عمریوں میں حالی نے ممدوحین کے اوصاف کو شائستگی سے پیش کیا ہے اور کردار کا ایک مثبت نقش ابھارا ہے۔(۶۵) ۳۔حالی کے مقالات ان کی سنجیدہ فکر کے مظہر ہیں۔(۶۶) ۴۔ذاتی خطوط میں ہمارے سامنے وہ حالی ہیں، جو قومی مفاد کو ذاتی منفعت سے داغ دار نہیں کرتے۔(۶۷)
۵۔''مجالس النسا'' بظاہر عورتوں کی اصلاحی کتاب ہے، لیکن اسے ناول کے سلسلہ کی ابتدائی کڑی شمار کرنا چاہیے۔(۶۸)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موضوع ڈاکٹر انور سدید کی گرفت میں ہے، لہٰذا انہیں اس موضوع پر مفصل لکھنا چاہیے تھا، تاہم دو اڑھائی صفحات پر محیط حالی کی گفتگو کو انہوں نے چند سطروں میں یوں سمیٹا کہ حالی کی مجموعی فنکارانہ حیثیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''حالی کی شاعری اور نثر کے اسلوب پر ان کے انکسار اور دردمندی کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ وہ قلوب مردہ کو جگانے اور ذہن کو خیال کی قوت سے متحرک کرنے کی سعی کرتے ہیں، چنانچہ سرسید نے جن قومی مقاصد کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تھا،

مصلح حالی نے نہ صرف انہیں قبول کیا، بلکہ مبلغ سرسید کا فریضہ بھی انجام دیا‘‘۔(۶۹)

تبسم کاشمیری کی رجحان ساز ’’اردو ادب کی تاریخ‘‘ جسے بجا طور پر اردو زبان و ادب کی تاریخ کا افتخار قرار دیا جا سکتا ہے، ۲۰۰۳ء میں سنگ میل لاہور کی طرف سے منصۂ شہود پر آئی۔ اس تاریخ کی حدود ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک ہیں اور ظاہر ہے کہ حالی کی زیادہ تر ادبی خدمات کا تعلق بعد کے دور سے ہے، تاہم ایک مقام پر مصنف نے کتاب کے باب اٹھارہ ’’دلی کی بزمِ آخر‘‘ کے حصہ ’’غالب‘‘ میں ان کی ابتدائی شاعری اور ان کی ادق زبان پر بات کرتے ہوئے ’’یادگارِ غالب‘‘ سے ایک اقتباس پیش کیا ہے، لیکن حالی کی اس رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، چنانچہ اردو ادب کی تاریخ میں حالی سے متعلق ڈاکٹر تبسم کے خیالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے کتاب کی دوسری جلد کا انتظار کرنا پڑے گا۔

اردو زبان و ادب کی ایک اہم تاریخ جسے ڈاکٹر جمیل جالبی کا شاندار علمی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے، ’’تاریخ ادب اردو‘‘ ہے، جس کی چار جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے اس کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں، دوسری ۱۹۸۲ء میں، تیسری جون ۲۰۰۶ء میں اور تیسری جلد ۲۰۱۲ء میں منصۂ شہود پر آئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ’’تاریخ ادب اردو‘‘ کی جلد دوم، سوم اور چہارم میں حالی کی بعض آرا پر تبصرہ کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ سطریں ’’حالی‘‘ کے علاوہ دیگر ابواب سے لی گئی ہیں:

۱۔ قصیدہ اس نیچرل شاعری کے خلاف ہے، جس کی تبلیغ ہمارے ہاں مولانا حالی سے شروع ہوتی ہے۔(۷۰) ۲۔ حالی نے ایک خاص قسم کی شاعری کے علاوہ ہر قسم کی شاعری اور اس کے مقاصد کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالی کی مسدس میں علویت پیدا ہو سکتی تھی، لیکن نیچرل شاعری کے نظریے نے اسے ابھرنے نہیں دیا۔(۷۱) ۳۔ حالی نے ’’سحر البیان‘‘ کے قصہ میں دیو پری کے استعمال کو اس کا نقص بتایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے تسلط کے بعد ہمارے ملک کے ادیب و نقاد مافوق الفطرت عناصر سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔(۷۲) ۴۔ قلق میرٹھی نے نصابی ضرورت کے لیے سب سے پہلے چند انگریزی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا، جو ۱۸۶۰ء میں الہ آباد سے شائع ہوا اور جس کا اثر حالی اور اسماعیل میرٹھی نے قبول کیا اور ویسی ہی انگریزی نظمیں نہ صرف ترجمہ کیں، بلکہ خود طبع زاد بھی لکھیں۔(۷۳) ۵۔ حالی نے ’مقدمہ شعر و شاعری‘ میں جب جدید اردو شاعری کو ایک صورت دینے

کی کوشش کی تو یہ نظیر کی غزلیں ہی تھیں، جنھوں نے اس عمل میں ان کا ساتھ دیا۔(۷۴) ۶-(حالی) نیچرل وقومی شاعری کی طرف آئے تو انیس کے مرثیوں نے انہیں ایک نیا راستہ دکھایا اور انہوں نے اپنی مشہور زمانہ مسدس مرثیے کی ہیئت اور اسی رنگ میں لکھی۔(۷۵) ۷-حالی کی قومی شاعری نے اقبال کی آفاقی شاعری کو جنم دیا۔(۷۶) ۸-حالی نے پرانے اسلامی اخلاق کو پھر سے زندہ کرنے پر زور دیا۔اسلام کو بھی نئے نئے معنی دیے۔(۷۷) ۹-حالی نے قدیم دور کے مسلمانوں کی سیاسی ترقی کی تصویر اجاگر کر کے اپنے عہد کے مسلمانوں کو یاس اور احساس محرومی سے نکالنے کی کوشش کی۔(۷۸) ۱۰-معاصرین اکبر میں مولانا الطاف حسین حالی ایسے ضرور گزرے ہیں، جو رو رو کر دل بھی بہلاتے ہیں اور اصلاح کی طرف بھی آجاتے ہیں۔(۷۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیالات پر مضمون کے آخری پیراگراف میں تبصرہ کیا جائے گا۔

اب تک مولانا حالی پر سب سے جامع مقالہ زیر نظر تاریخ کی چوتھی جلد میں ملتا ہے، جو ایک سو سے زائد حوالوں سے مزین ہے۔ڈاکٹر جالبی نے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی تمہید، حالاتِ زندگی، حالی کی تصانیف، حالی کی قومی شاعری، حالی کی غزل، حالی کی نثر، حالی بحیثیت نقاد، حالی کی طرز ادا اور حالی کی تاریخی اہمیت۔

تمہید میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے پہلے ہی جملہ میں حالی سے متعلق یہ کہہ کر کلیدی نکتہ بیان کر دیا کہ سرسید تحریک کو ادبی تحریک بنانے والے مولانا حالی تھے۔(۸۰) ان کے خیال میں سرسید نے انگریزی نشاۃ الثانیہ کو منزل بنایا تھا اور انگریزوں کی طرح ہو جانے کا درس دیا تھا، جبکہ ان کے بقول:

> ”حالی نے بتایا کہ ہمیں انگریزوں کی کامیابی سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے عیوب پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔قوم کی ترقی انگریزوں کی ریس سے ہٹ کر بھی ہو سکتی ہے۔مسدس میں انہوں نے اپنی قومی وملّی روایات کو ابھارا اور اس دور کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خرابیوں کا بھی احساس دلایا“۔(۸۱)

ڈاکٹر جالبی نے محض اس ایک جملہ میں حالی کی ساری ادبی شخصیت کو ظاہر کر دیا کہ ان کی خاموش ومتین فطرت میں قدرت نے ایک ایسی نظر ودیعت کی تھی، جو علوی چیزوں کو دیکھ کر انہیں اپنانے اور تخلیق کا جامہ پہنانے کی بڑی صلاحیت رکھتی تھی، چنانچہ انہیں حالی اردو ادب کی تاریخ میں

ایک رہبر شخصیت کی طرح بلند منبر پر کھڑے دور ہی سے نظر آجاتے ہیں۔(۸۲)

کسی قدر مفصل حالاتِ زندگی کے بعد حالی کی نثر و نظم پر مشتمل تصانیف کا مختصر لیکن تحقیقی تعارف پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر جالبی نے کلامِ حالی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی ''حالی کی قومی شاعری'' اور ''حالی کی غزل''۔ ''حالی کی غزل'' کو ''حالی کی قومی شاعری'' سے پہلے زیر بحث لانا چاہیے تھا، اس لیے کہ قومی شاعری سے بہت پہلے حالی بطور غزل گو معروف ہو چکے تھے اور یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ایک غزل گو شاعر ہی انجمن پنجاب کے زیر اثر پہلے فطرت نگار اور پھر قومی شاعری کی منزلیں طے کر سکا۔ بہر حال مورخ حالی کی قومی شاعری کے پس منظر میں جھانکنے میں پوری طرح کامیاب رہا ہے۔ جالبی لکھتے ہیں:

> ''حالی ہمارے پہلے شعوری شاعر ہیں۔ وہ جو کام کر رہے ہیں اور جس قسم کی شاعری وہ لکھ رہے ہیں، اس پر انھوں نے پہلے سے غور و فکر کر کے لائحہ عمل طے کیا ہے۔ ان کے ہاں اسی لیے تخلیق و تنقید متوازن طور پر ساتھ چلتی ہیں۔ اپنی نظموں پر وہ تنقیدی نظر سے قاری کے ذہن کو اس طرف لے آتے ہیں، جو ان کی تخلیق و شاعری کا مقصد اولین ہے''۔(۸۳)

روایتی غزل گو ان کے ہاں فکری تبدیلی کو سمجھنے کے لیے مورخ نے خود حالی کی تحریروں سے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں، جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پنجاب بک ڈپو اور انجمن پنجاب کے مشاعروں کی وجہ سے مشرقی شاعری کی بعض کمزوریوں سے روشناس ہوئے، جس کے نتیجہ میں ان کے ہاں ایک ذہنی انقلاب برپا ہوا، جس نے ان کی شاعری کا رخ ہی موڑ دیا۔

مسدسِ حالی (۱۸۷۹ء) کو ڈاکٹر جالبی نے پہلی نظم قرار دیا ہے، ''جس کو تنقید حیات کہا جا سکتا ہے''۔(ص ۹۲۵) ڈاکٹر صاحب مسدس کی چند بنیادی خصوصیات لکھتے ہیں:

> ''حالی قوم کی حالت پر بے لاگ تنقید کرتے ہیں۔ وہ نہ برائیوں کو طنز میں اڑاتے ہیں اور نہ اچھائیوں پر فخر کرتے ہیں۔ وہ ہجو و قصیدہ دونوں کی راہ ترک کر کے ایک صحیح نظر اور سائنسی تحلیل کی مثال قائم کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ موضوع شاعری کے بجائے نثر کا ہے، مگر حالی کی جدت یہ ہے کہ وہ اسے شاعری کے

درجہ پر لے آتے ہیں اور اس سے عقل کو متاثر کرنے کے بجائے جذبات کو متاثر کر کے قوم کو جوشِ غیرت دلاتے ہیں''۔(۸۴)

سر سید کے خیالات اور منصوبوں کے برعکس حالی انگریزی نشاۃ الثانیہ کو اسلامی نشاۃ الثانیہ میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اسلام، اردو شاعری کا اہم موضوع بن جاتا ہے(۸۵)، چنانچہ ڈاکٹر جالبی نے مسدس کے ضمیمہ سے چند اشعار پیش کیے ہیں، جسے حالی کی طرف سے شکوہ قرار دیا جاسکتا ہے، یعنی:

کل دیکھیے، پیش آئے غلاموں کو ترے کیا اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں، پھر آخر ہیں تمہارے نسبت بہت اچھی ہے، اگر حال برا ہے

اور جب نظم کا خاتمہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں:

ہاں، حالیِ گستاخ نہ بڑھ حد ادب سے باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی ان آخری اشعار سے درست نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جو شکوہ حالی نے رسولِ کریمؐ سے کیا تھا، اقبال اپنی مشہورِ زمانہ نظم ''شکوہ'' کا سرا جوڑ کر اور رسولِ کریمؐ کے بجائے خدا سے مخاطب ہو کر اپنی نظم کی تکمیل کرتے ہیں۔(۸۶)

مورخ نے 'روایت سے متعلق، موضوعاتِ شاعری، حق گوئی اور واقعیت، نیچرل رنگ سخن، ترنم اور شاعری کا نیا تصور میں حالی کی قومی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنی بات اس خیال پر ختم کی کہ حالی کے نزدیک شاعر وہ ہے، جو مبالغہ اور جھوٹ سے بچ کر نہ صرف نئی بات کہتا ہو، بلکہ اصلاحِ احوال کے لیے نئی ہدایت بھی دیتا ہو۔ یہ ہے وہ نیا ادراک اور نئی حسیت، جو حالی نے اردو شاعری کو دی ہے۔(۸۷)

حالی کی غزل پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی نے حالی، غالب و شیفتہ کے اثرات، قدیم سے جدید کی طرف رجحان اور دیوانِ حالی کے تعارف کے بعد حالی کی غزل کا فکری و فنی حوالے سے جائزہ لیا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بقول:

''بحیثیت مجموعی، حالی کی غزل میں ایک ایسا توازن ملتا ہے، جو عام طور پر ان کے ہم عصروں میں نہیں ہے۔ ان کے اصلاح پسند مزاج نے ہوس والے عشق اور

معاملہ بندی کو ایک طرف اور بلند پروازی یا ضرورت سے زیادہ رنگینی کو دوسری طرف ترک کردیا تھا۔ دلِ دردمند نے انہیں میر کی طرف رجوع کیا، غالب کے اثر سے ان کے ہاں حسن تخیل، ندرتِ فکر اور شوخی آئی، سعدی شیرازی نے سادہ بیانی کی ترغیب دی اور شیفتہ سے انھوں نے سیدھی سچی باتوں کو حسن بیان سے دل فریب بنانے کا سلیقہ سیکھا''۔(۸۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی آزاد، شبلی اور نذیر احمد کی شاعری کو نظرانداز کرنے سے تاریخ ادب میں کوئی ضروری فرق محسوس نہیں کرتے ،مگر حالی کی نظم ونثر دونوں میں سے کسی کو چھوڑ نہیں سکتے۔(۸۹)

حالی کی تینوں سوانح عمریوں اور مقدمہ شعروشاعری کے علاوہ ڈاکٹر جالبی مجالس النسا کو اس لیے اہم قرار دیتے ہیں کہ وہ قصے کے انداز اور مکالموں کے پیرایے میں لکھی گئی ہے، البتہ وہ اس کی کہانی کو بے ربط قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حالی قصہ بنانے کی کوشش تو کرتے ہیں، لیکن قصہ ہر جگہ اصلاح میں گم ہوجاتا ہے۔(۹۰)

حالی کی سوانح عمریوں میں ''حیاتِ سعدی'' کو اولیت حاصل ہے۔ حالی نے حیاتِ سعدی کے واقعات ولطائف کو ترتیب سے پیش کردیا ہے، مگر ان کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اہم اور تاریخی شخصیات کی کردار فہمی کی طرف توجہ نہیں دی، اسی لیے سعدی شیرازی کے وہ حالات جو بحیثیت انسان انہیں نمایاں کرتے، مفقود ہیں(۹۱)۔ تصانیف و کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے حالی کی بعض کمزوریوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں:

> حیاتِ سعدی، اردو ادب میں تاریخی وتنقیدی تحقیق، ادبی سوانح نگاری اور ایک فرد پر تنقید کا پہلا نمونہ ہے۔ حالی نے مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب میں بڑی کاوش اور صحت سے کام لیا ہے اور اس حد تک وہ کامیاب تاریخ نگار ہیں۔ یہ تصنیف ہمیں تاریخی حالات سے ایک فرد کے کردار کی تعمیر پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کا جائزہ لینے کی پہلی کوشش ہے اور حالی جس حد تک جاتے ہیں، وہ یقیناً قابل تحسین ہے''۔(۹۲)

''حیاتِ سعدی'' کے بعد حالی نے ''یادگارِ غالب'' تحریر کی۔ ڈاکٹر جالبی اسے ''حیاتِ سعدی''

کی توسیع قرار دیتے ہیں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ حالی نے غالب کو اخلاقی نمونہ بنانے کی کوشش نہیں کی، البتہ انہیں حالی سیرت نگاری کی طرف آتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں (۹۳)۔ اگرچہ انہیں گلہ ہے کہ غالب کے بارے میں حالی کو ذاتی طور پر جو معلومات میسر تھے، ان کی اگر وہ نفسیاتی تحلیل کرتے اور ان کی زندگی کے حالات وواقعات سے ان کے تخلیقی کارناموں کو ملا کر دیکھتے تو نہ صرف بایوگرافی کا حق ادا کرتے، بلکہ قوم کو بھی زیادہ فائدہ پہنچاتے، تاہم وہ اس کی خوبیوں کے معترف ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

> ''یادگارِ غالب میں حالی نے جو کچھ کیا، وہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کی شاعری اور نثر دونوں پر جو ابتدائی تنقید یہاں ملتی ہے، وہ مطالعہ غالب کی عمارت کی بنیاد ہے۔ حالی نے غالب کی غلطیاں اور غلط فہمیاں بھی بتائی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یادگارِ غالب پڑھ کر غالب کے کلام سے انس اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے اور یہی انس اور لگاؤ جو یادگارِ غالب نے پیدا کیا، غالب کی شہرت کی بنیاد ہے۔ غالب کو آسان اور مقبول بنانے میں حالی کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے اور اسی لیے غالب کا ہر مطالعہ کرنے والا تصنیف حالی کو پڑھتا رہے گا''۔ (۹۴)

''حیاتِ جاوید'' حالی کی سب سے مقبول لیکن متنازع سوانح عمری ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے دیباچہ حیاتِ جاوید میں بیان کیے گئے اصولوں کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ حیاتِ جاوید کو مدلل مداحی قرار دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حالی محض ایک نقطۂ نظر سے (جو سرسید کا بھی نقطہ نظر تھا اور خود حالی کا بھی) سرسید کو دیکھتے ہیں، جس سے حق رفاقت تو ادا ہوجاتا ہے، لیکن بایوگرافی کے فرائض دور جا پڑتے ہیں (۹۵)، تاہم وہ اسے انگریزی بایوگرافی کے معیار سے فروتر سمجھنے کے باوجود یقین رکھتے ہیں کہ ''حیاتِ جاوید'' کو زندگی جاوید حاصل رہے گی، کیونکہ:

> ''اگر بایوگرافی کی حیثیت سے اس میں خامی نظر آتی ہے تو بھی اس کا جواز یہ ہے کہ بایوگرافی کے بارے میں حالی کا زاویۂ نظر وہی تھا، جو اس سے نمایاں ہوا ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے تھے اور اس نظر کے علاوہ کوئی اور زاویۂ نظر نہیں رکھ سکتے تھے، لہٰذا ہمیں ''حیاتِ جاوید'' کو سرسید کے بارے میں حالی کے انفرادی رویے کا اظہار اور بایوگرافی کے تعلق سے انفرادی طریق کار کا انکشاف سمجھنا چاہیے۔ اسی

وقت یہ ایک قابلِ قدر تخیلی اور فنی کارنامہ نظر آئے گی، جس میں سرسید کے بارے میں ایک دوامی نظریہ کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اسی لیے اردو ادب میں اسے دوام حاصل ہے اور دوام حاصل رہے گا''۔(۹۶)

مقدمہ شعر و شاعری پر بحث کرنے اور اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر جالبی نے اسے ایک نظام تنقید وضع کرنے کی پہلی کامیاب کوشش قرار دیا ہے(۹۷)۔ وہ حالی کے اس تنقیدی کارنامے کی اہمیت وافادیت کے بارے میں بالکل واضح ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

''نقاد کی زندگی اس بات میں نہیں ہے کہ سب کے سب اس کی ساری باتیں قبول کرلیں یا اس کی سب باتوں کو رد کردیں، بلکہ اس میں ہے کہ اس کی باتیں غور و فکر اور بحث مباحثہ کے لیے ایک میدان کھول دیں اور ان پر بحث ہوتی رہے۔ حالی کے ''مقدمہ'' نے بحث و تمحیص کا ایسا راستہ کھولا کہ آج سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود ''مقدمہ'' مسلسل زیر بحث آرہا ہے''۔(۹۸)

حالی بحیثیت نقاد میں ڈاکٹر جالبی نے حالی کے مقدمہ، سوانح عمریوں، مقالات اور خطوط کی مدد سے ان کی تنقیدی حیثیت کو سمجھنے سمجھانے اور مغربی تنقید کے تناظر میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے حالی کی تنقیدی خدمات کے مفصل جائزے کے بعد یہ کہہ کر بطور نقاد ان کی حیثیت کا تعین کردیا ہے کہ یورپ کے اول درجہ کے نقادوں کی محفل میں ہم اگر کسی نقاد کو بھیج سکتے ہیں تو وہ حالی ہیں۔ وہ ہمارے ایک ایسے نقاد ہیں، جو صحیح معنی میں تخلیقی تنقید کرتے ہیں۔(۹۹)

حالی کی طرزِ ادا میں حالی کے اسلوب کی انفرادیت تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جالبی نے حالی کی سادگی کو اولیت دی ہے۔ انھوں نے میر وانیس کے علاوہ سرسید کی سادگی کا ذکر کیا، لیکن حالی کی سادگی ان سب سے منفرد ہے۔ ڈاکٹر جالبی کے خیال میں یہ سادگی معلوم تو قدرتی ہوتی ہے، مگر قدرتی طور پر یہ اسی شخص میں ہوسکتی ہے، جس کا ذہن جذبات پر قابو رکھتا ہو اور وہ اثر انگیزی کے بجائے وضاحت پر تکیہ کرتا ہو(۱۰۰)۔ چونکہ وہ ایسی سادگی کے لیے ''توازن'' کو شرط قرار دیتے ہیں، جو سرسید کی نسبت حالی کے ہاں زیادہ ہے، چنانچہ اس نئی قسم کی سادگی کو برتنے میں وہ (حالی) زیادہ کامیاب ہیں۔ یہ سادگی ''یکسانیت'' اور ''توضیحی طرز'' کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، البتہ یہ

اسلوب بتدریج خطیبانہ رنگ اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ڈاکٹر جالبی، حالی کے اسلوب میں انگریزی اور عربی کے ایسے الفاظ کا ذکر بھی کرتے ہیں، جس سے اس کی عبارت میں بھدّاپن پیدا ہوگیا ہے(۱۰۱)، لیکن وہ حالی کی شاعری میں بعض مواقع پر پنجابی مصادر کے استعمال کو نظر انداز کر گئے، جو اجنبی محسوس ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے مقام پر ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔

''حالی کی تاریخی اہمیت'' میں ڈاکٹر جالبی نے شاعری میں ''علامہ اقبال اور نثری ادب میں شبلی نعمانی کو حالی کے خاموش انقلاب کی پیداوار'' قرار دیا ہے(۱۰۲)، بلکہ وہ یہاں تک کہہ گئے کہ آج ہم سب حالی کی امت بن گئے ہیں(۱۰۳)۔ان کے خیال میں حالی تاریخ میں اردو ادب کے مصلح اور جدید ادب کے بانی کی حیثیت سے قائم رہیں گے(۱۰۴) اور جس طرح چودھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے دانتے، سولہویں صدی میں فرانس کے رونسار، سترہویں صدی میں انگلستان میں اسپینسر، اٹھارہویں صدی میں جرمنی میں لیسنگ اور انیسویں صدی میں روس میں پشکن اپنے اپنے ادب کو قومی درجہ پر لے آئے تھے، بعینہٖ انیسویں صدی کے نصف آخر میں حالی بھی ادب کو ''سخن'' کے درجہ سے اٹھا کر ادب بنانے کا یہی کام انجام دیتے ہیں اور اس طرح ادب کو قوم کا سرمایہ بنا دیتے ہیں۔(۱۰۵)

یہاں وہ قومی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ آج ہمیں پھر ایک حالی کی ضرورت ہے، مگر سوال یہ ہے کہ سرسید کو کہاں سے لائیں گے(۱۰۶)؟ گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ حالی کا وجود سرسید کا مرہونِ منت ہے۔ پچاسی صفحات پر حالی پر بھرپور تنقیدی نظر ڈالنے اور تاریخ ادب اردو میں حالی کی قدر و قیمت کے تعین کے بعد ڈاکٹر جالبی کا یہ سوال خود ان کی تنقیدی بصیرت پر سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

مولانا حالی کے شعری و نثری کارناموں سے متعلق اردو کی مندرجہ بالا ادبی تاریخوں کے بالاستیعاب مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخ نے حالی کو سمجھنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی ہے، البتہ رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، سید احتشام حسین اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخی بصیرت نے حالی سے متعلق زیادہ بہتر نتائج برآمد کیے ہیں۔ مورخین میں سے رام بابو سکسینہ ''اگر مگر'' کا شکار رہے، جبکہ حامد حسن قادری اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے حالی کے فکر و فن پر مفصل بحث کر کے حالی کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ استخراج نتائج کے اعتبار سے سید احتشام حسین زیادہ

کامیاب رہے ہیں۔

حوالے

(۱)رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا محمد عسکری، مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، لاہور: علمی بک ہاؤس، ۱۹۸۴ء، ص ۳۰۵۔ (۲) ایضاً ص ۳۰۸۔ (۳) ایضاً ص ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ (۴) ایضاً ص ۳۱۱۔ (۵) ایضاً ص ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ (۶) ایضاً ص ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ (۷) ایضاً ص ۳۱۵۔ (۸) ایضاً۔ (۹) ایضاً ص ۳۱۷۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) ایضاً۔ (۱۲) ایضاً ص ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ (۱۳) ایضاً ص ۳۱۸۔ (۱۴) ایضاً۔ (۱۵) ایضاً ص ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ (۱۶) ایضاً ص ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ (۱۷) ایضاً ص ۴۱۷۔ (۱۸) گیان چند، ڈاکٹر: اردو کی ادبی تاریخیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۹۱۴۔ (۱۹) حامد حسن قادری: داستانِ تاریخِ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء چہارم، ص ۶۳۷۔ (۲۰) ایضاً۔ (۲۱) ایضاً ص ۶۳۸۔ (۲۲) ایضاً۔ (۲۳) ایضاً ص ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ (۲۴) ایضاً ص ۶۳۹۔ (۲۵) ایضاً ص ۶۴۱۔ (۲۶) ایضاً۔ (۲۷) ایضاً ص ۶۴۳۔ (۲۸) ایضاً ص ۶۴۴۔ (۲۹) ایضاً۔ (۳۰) ایضاً۔ (۳۱) ایضاً ص ۶۷۵۔ (۳۲) ایضاً۔ (۳۳) ڈاکٹر ابوسعید نورالدین: تاریخ ادبیات اردو (حصہ اول)، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ (۳۴) ایضاً ص ۲۰۲۔ (۳۵) ایضاً۔ (۳۶) ایضاً ص ۲۰۳۔ (۳۷) ایضاً ص ۲۰۶۔ (۳۸) ایضاً۔ (۳۹) ایضاً ص ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ (۴۰) ایضاً ص ۲۰۸۔ (۴۱) ڈاکٹر ابوسعید نورالدین: تاریخ ادبیات ارو (حصہ دوم)، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص ۸۶۵۔ (۴۲) ایضاً ص ۸۶۷۔ (۴۳) ایضاً ص ۸۷۵۔ (۴۴) ڈاکٹر سلیم اختر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲۸۔ (۴۵) ایضاً۔ (۴۶) ایضاً۔ (۴۷) ایضاً ص ۳۲۹۔ (۴۸) ایضاً۔ (۴۹) سید احتشام حسین: اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۱ء ہشتم ص ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ (۵۰) ایضاً ص ۱۹۲۔ (۵۱) ایضاً۔ (۵۲) ایضاً۔ (۵۳) ایضاً ص ۱۹۳۔ (۵۴) ایضاً ص ۲۲۴۔ (۵۵) ایضاً ص ۲۲۷۔ (۵۶) ایضاً۔ (۵۷) ایضاً۔ (۵۸) ایضاً ص ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ (۵۹) ایضاً ص ۲۲۸۔ (۶۰) ایضاً ص ۲۲۹۔ (۶۱) ایضاً۔ (۶۲) ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، تاریخ ادبیات ارو (حصہ اول) محولہ بالا ۳۳، ص ۲۰۶۔ (۶۳) سید احتشام حسین: اردو ادب کی تنقیدی تاریخ محولہ بالا ۴۹، ص ۱۹۲۔ (۶۴) ڈاکٹر انور سدید: اردو ادب کی تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، ۱۴۔ ۲۰۱۳ء دہم، ص ۲۸۲۔ (۶۵) ایضاً ص ۲۸۳۔ (۶۶) ایضاً۔ (۶۷) ایضاً۔ (۶۸) ایضاً۔ (۶۹) ایضاً ص ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ (۷۰) ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو (جلد دوم)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء، سوم، ص ۶۹۶۔ (۷۱) ایضاً ص ۶۹۹۔ (۷۲) ایضاً ص ۸۶۹۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ایک اقلیتی ادارہ

پروفیسر مرزا اسمر بیگ

ہندوستانی مسلمانوں کی متاع عزیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آزادی کے بعد سے مختلف مسائل سے دوچار رہی ہے اور اپنی بقا کی جنگ لڑتی رہی ہے۔اس وقت وہ خاص طور سے ایک بہت نازک دور سے گذر رہی ہے۔اس کا اقلیتی کردار سپریم کورٹ میں زیر بحث ہے۔گذشتہ حکومت نے عدالت میں اقلیتی کردار کی حمایت کی تھی۔ اس کے برخلاف موجودہ حکومت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کے خلاف ہے۔اٹارنی جنرل کا کہنا ہے کہ ایک سیکولر ملک کی حکومت کوئی اقلیتی ادارہ قائم نہیں کرسکتی۔اس وجہ سے موجودہ حکومت ۱۹۶۷ء کے پانچ رکنی بنچ کے فیصلے اور ۲۰۰۵ء کے الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ سے اتفاق رکھتی ہے۔جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ یونیورسٹی ایک اقلیتی ادارہ نہیں ہے۔حکومت کے اس فیصلہ نے ایک بہت نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔

اس بحث میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اقلیتوں کو خصوصی حقوق کیوں دیے گئے ہیں۔ ہندوستان کے دستور کے آرٹیکل ۲۹ میں کسی خاص کلچر،رسم الخط اور زبان کے تحفظ کا حق دیا گیا ہے۔ یہ تحفظ سب سے بہتر طریقے سے ایک اقلیتی تعلیمی ادارے میں ہی ہوسکتا ہے۔آرٹیکل (۱)۳۰ اقلیتوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے بنائیں اور چلائیں۔ ہندوستان میں زیادہ تر اقلیتی ادارے لسانی اقلیتوں کے ہیں۔ ملک میں سینکڑوں سندھی،ٹمل،تیلگو اور گجراتی اقلیتی ادارے ہیں۔ ایک اقلیتی ادارہ میں اس کو بنانے والی اقلیت کے افراد کے لیے نشستیں مختص کی جاسکتی ہیں۔ہندوستان کے دستور کا آرٹیکل (۵)۱۵ اقلیتی اداروں کو یہ چھوٹ دیتا ہے کہ وہ ST,SC, اور OBC کے لیے تحفظات فراہم نہ کریں۔

صدر شعبۂ سیاسیات،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ۔

ریاست آرٹیکل (۲)۳۰ کے تحت تعلیمی اداروں کو امداد دینے میں کسی اقلیتی ادارے کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کر سکتی۔ سپریم کورٹ پہلے ہی یہ واضح کر چکا ہے کہ آرٹیکل ۳۰ میں جن تعلیمی اداروں کا ذکر ہے ان میں یونیورسٹی بھی شامل ہے اور اقلیتیں اپنے اداروں کو اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں چلا سکتی ہیں۔ اس طرح ایک اقلیتی گروپ اگر چاہے تو ایک یونیورسٹی بنا سکتا ہے جو سرکار کی نگرانی میں کام کرے گی اور اس کی ڈگریاں دوسری یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کے برابر ہوں گی۔ سپریم کورٹ کا ماننا ہے کہ دستور کے یہ قوانین ملک کی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے بہت اہم ہیں۔

۱۹۶۷ء کے عزیز پاشا کیس میں سپریم کورٹ نے یہ کہا تھا کہ Governor General in Council نے اے۔ ایم۔ یو۔ کو قائم کیا تھا اس لیے مسلمانوں کو اس کا نظام چلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس مقدمہ میں اے۔ ایم۔ یو۔ کو سنے بغیر ہی سپریم کورٹ نے اس کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔ کورٹ کی یہ دلیل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء کو بنیاد بنا کر دی گئی تھی۔ کورٹ کا یہ ماننا تھا کہ مسلمانوں نے اپنی یونیورسٹی کی ڈگریوں کی منظوری کے بدلے اپنے اقلیتی کردار کو قربان کر دیا تھا۔

پاشا کیس نے جو شبہات پیدا کیے تھے ۱۹۸۱ء کے ایکٹ نے ان کا تدارک کر دیا تھا۔ مجلس قانون ساز نے یہ موقف اختیار کیا کہ پارلیمنٹ نے صرف اے۔ ایم۔ یو۔ کو قانونی حیثیت دی تھی اور اصل میں اسے مسلمانوں نے ہی قائم کیا تھا۔ پارلیمنٹ نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اے۔ ایم۔ یو۔ دونوں ایک ہیں۔ اس لیے آج یہ کہنا کہ عزیز پاشا کا فیصلہ ابھی بھی اچھا قانون ہے غلط ہوگا۔ لیکن ۲۰۰۵ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے ہندوستان کی پارلیمنٹ کی ۱۹۸۱ء کی ترمیم کو رد کر دیا۔ حالانکہ پارلیمنٹ کے بنائے قانون کی آئینی حیثیت کو جانچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ نے جس موضوع پر قانون بنایا ہے وہ ریاستی اسمبلی کے مخصوص دائرۂ کار میں نہ ہو۔ اے۔ ایم۔ یو۔ کا خاص طور پر Union List میں ۶۳ نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں پارلیمنٹ کی قانون سازی کی اہلیت پر سوالیہ نشان نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ سوال پاشا کیس میں بھی نہیں اٹھا تھا لیکن الٰہ آباد ہائی کورٹ نے ۲۰۰۵ء میں یہ نیا سوال کھڑا کر کے پارلیمنٹ کی اہلیت کو محدود کر دینے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے مقدموں میں سپریم کورٹ کے فیصلوں کو پارلیمنٹ نے رد

کیا ہے۔ ابھی حال ہی محمود آباد کے راجہ کے حق میں جو فیصلہ سپریم کورٹ نے کیا تھا، اسے سرکار نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ رد کردیا۔ کچھ دنوں پہلے Vodafone کے کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو پارلیمنٹ نے ایک ترمیم کے ذریعہ تبدیل کردیا تھا۔ ۲۰۰۵ء کے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے نے ۱۹۸۱ء کی ترمیم کو منسوخ کرکے قانون کے ایک اہم اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔

ہندوستان میں پارلیمنٹ کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنائے جو شہریوں کے بنیادی حقوق سے ٹکرائے، لیکن اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے ہر طرح کے قانون بنانے کا حق ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۲۰ء کا ایکٹ ایک ایسا قانون تھا جو قانون ساز اسمبلی نے مسلمانوں کے بنیادی حقوق کو فروغ دینے کے لیے بنایا تھا۔ اسی طرح کے دوسرے قوانین کئی ریاستوں میں اقلیتی یونیورسٹیوں کو قانونی درجہ دینے کے لیے پاس کیے گئے۔ MHRD نے اقلیتوں کے لیے کئی Deemed یونیورسٹیاں UGC Act 1956 کے Section 3 کے تحت قائم کی ہیں۔

اس قانون پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بنیادی حقوق کبھی ساقط نہیں کیے جاسکتے۔ پاشا کیس میں سپریم کورٹ نے یہ غلط فیصلہ کیا کہ مسلمانوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نظام چلانے کا حق سرکار کو سونپ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی اقلیت اپنی یونیورسٹی قائم نہیں کرسکتی کیونکہ اس کو قانونی درجہ سرکار ہی دے سکتی ہے اور ایسا کرتے ہی وہ سرکاری ادارہ ہوجائے گا۔ کورٹ کا یہ کہنا ایسا ہی ہے کہ کسی کے بچے کی پیدائش کے بعد اس کا رجسٹریشن میونسپلٹی میں ہی ہوسکتا ہے اور جب وہ ایسے کرے تو سرکار یہ کہے کہ اس نے اس کی پیدائش کا رجسٹریشن سرکار کے ساتھ کیا ہے اس لیے یہ بچہ اب سرکار کا ہوگیا۔ لیکن اگر پاشا کیس کے اس فیصلہ کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اسے سپریم کورٹ کی اس سے بڑی بنچ نے منسوخ کردیا ہے۔ ۱۹۷۴ء کے St.Xaviers کیس میں سپریم کورٹ نے کہا تھا کہ اقلیتوں کی کوئی ایک نسل اس کی دوسری نسل کے بنیادی حقوق سے اپنا مطالبہ واپس نہیں لے سکتی ہے۔

تاریخی پس منظر: ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خاں کو یقین ہوگیا کہ انگریز اب ہندوستان سے جلد جانے والے نہیں ہیں اور سرکار میں شمولیت کا راستہ صرف تعلیم کے ذریعہ ہے۔ اس لیے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے Society for the Diffusion of Western Learning Among Muslims کا قیام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے موضوع پر لوگوں سے مضمون لکھوائے۔

۲۳ لوگوں نے مضمون بھیجے اور کئی نے یہ لکھا کہ مسلمان سرکاری تعلیمی اداروں کا صحیح استعمال نہیں کررہے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ مسلمانوں کو یہ یقین ہے کہ اگر وہ ان سرکاری اداروں میں جائیں گے جہاں دینی تعلیم نہیں دی جاتی تو ان کی مذہب سے وابستگی کمزور پڑ جائے گی۔ اس لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جہاں مشرقی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے۔ لیکن اس طرح کی تعلیم مسلمانوں کے اپنے ادارے ہی میں دی جا سکتی تھی۔ اس لیے ان لوگوں نے District Collector سے ایک یونیورسٹی بنانے کی اجازت مانگی۔

انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ آہستہ آہستہ اس سمت میں آگے بڑھیں۔ پہلے ایک اسکول بنائیں، پھر ایک کالج اور اس کے بعد ایک یونیورسٹی۔ اس لیے پہلے ایک اسکول بنایا گیا جو ۱۸۷۷ء میں کالج بن گیا، جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تھا۔ کالج کے افتتاحی جلسے میں وائسرائے کی موجودگی میں سرسید نے یہ صاف ظاہر کردیا کہ ان کا ارادہ ایک یونیورسٹی بنانے کا ہے۔ اس ارادہ کا اظہار اس کے بعد ہر سال وائس رائے کی موجودگی میں ہوتا تھا۔ سرکار نے بھی کالج کو یونیورسٹی بنانے کے منصوبے کی حمایت کی۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات ہوگئی۔ تعزیتی اجلاس میں یہ کہا گیا کہ سرسید کے لیے بھرپور خراج تحسین یہ ہوگا کہ ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس کے لیے سرکار کی مدد درکار تھی۔ سرکار نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس کے لیے ۳۰ لاکھ روپے جمع کریں۔ اس وقت یہ بڑی رقم تھی لیکن کسی طرح اسے جمع کیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس ہوا۔ اس ایکٹ کے ساتھ ۱۲۴ لوگوں کی ایک لسٹ ہے جو اس کے بانی رکن ہیں اور یہ سبھی مسلمان ہیں۔ ایکٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ مسلمان طالب علموں کے لیے دینی تعلیم لازم ہوگی اور مسلم لڑکیوں کے لیے پردہ کا معقول انتظام ہوگا۔ یونیورسٹی کی سپریم گورننگ کونسل جس کا نام کورٹ ہوگا اس کے سبھی رکن مسلمان ہوں گے اور وہی وائس چانسلر کا تقرر کریں گے۔ اس طرح یہ واضح ہے کہ وہ ایک مسلم ادارہ تھا جو ۱۹۲۰ء میں کالج سے یونیورسٹی بنا۔ کیونکہ لازمی دینی تعلیم ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کا حصہ تھی اور یہ ہندوستان کے دستور کے آرٹیکل ۲۸(۳) کے خلاف تھا، جس میں یہ کہا گیا کہ کسی انسان کو جبراً مذہبی تعلیم اس تعلیمی ادارہ میں نہیں دی جا سکتی جو ادارہ سرکار سے امداد لیتا ہو۔ اس لیے اے۔ ایم۔ یو۔ ایکٹ کو ۱۹۵۱ء میں ترمیم کیا گیا اور

مذہبی تعلیم کو اختیاری کر دیا گیا۔اہم بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کو ممنوع نہیں کیا گیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پارلیمنٹ اسے اقلیتی ادارہ نہ سمجھتی تو اختیاری مذہبی تعلیم پر بھی روک لگا دیتی۔

۱۹۶۵ء تک کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا۔ ۱۹۶۵ء میں یونیورسٹی میں انٹرنل طلبہ کے لیے ریزرویشن کو ۷۵ فیصد سے گھٹا کر ۵۰ فیصد کر دیا گیا۔اس فیصلے کی یونیورسٹی میں بہت مخالفت ہوئی اور تشدد بھی ہوا۔اس وقت کے وائس چانسلر علی یاور جنگ پر بھی حملہ ہوا۔اس صورت حال میں سرکار نے یونیورسٹی پر ایک آرڈیننس نافذ کر دیا۔کورٹ اور ایکزیکیوٹیو کاونسل کو ہندوستان کے صدر کے نمایندوں سے بھر دیا گیا۔

کچھ مسلمان یونیورسٹی سے مشورہ کیے بغیر سپریم کورٹ چلے گئے۔عزیز پاشا ان میں سے ایک تھے۔ ۱۹۶۷ء کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے کہا کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے نہیں بلکہ قانون ساز اسمبلی نے اے۔ایم۔یو۔کو قائم کیا تھا اس لیے اسے ہی اس کا نظام چلانے کا حق ہے۔

اس فیصلے کے بعد اے۔ایم۔یو۔ کے پرانے طالب علموں اور خیر خواہوں نے اے۔ایم۔یو۔ کے اقلیتی کردار کو بحال کرنے کے لیے ایک تحریک چلائی۔ یہ تحریک ۱۹۸۱ء تک چلی جب سرکار نے ان کی مانگ کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۸۱ء میں اسے اے۔ایم۔یو۔ ایکٹ میں Section5(2)(c) کو جوڑا گیا۔ یہ یونیورسٹی کو اختیار دیتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے کلچر اور تعلیمی ترقی کے لیے کام کرے اے۔ایم۔یو۔کورٹ کے اختیارات کو بھی بحال کر دیا گیا اور وہ ایک بار پھر سپریم گورننگ باڈی ہوگئی۔ ۱۹۸۱ء کے بعد سے یہ بالکل صاف ہو گیا کہ اے۔ایم۔یو۔ایک اقلیتی ادارہ ہے۔

اس کے بعد یہ کہنا کہ اے۔ایم۔یو۔ ایک اقلیتی ادارہ نہیں ہے آرٹیکل ۳۰ کے دائرہ کو محدود کرنا ہوگا۔ ۲۰۰۲ء میں سپریم کورٹ کی گیارہ ججوں کی بنچ نے ٹی ایم اے پائی فاؤنڈیشن کیس میں صاف کہا تھا کہ ''اپنی پسند کا تعلیمی ادارہ'' جو آئین کے آرٹیکل ۳۰ میں موجود ہے اس کا مطلب ہر سیول کی تعلیم ہے، جس میں یونیورسٹی شامل ہے۔ یہاں تک کہ عزیز پاشا کیس میں بھی سپریم کورٹ نے مان لیا تھا کہ اس جملہ کے مطلب میں یونیورسٹی شامل ہے۔اس لیے ایک مرکزی یونیورسٹی بھی ایک اقلیتی ادارہ ہوسکتی ہے اگر اس کو قانونی درجہ دینے والا قانون پارلیمنٹ نے پاس کیا ہو۔اس وقت کی انسانی وسائل کی ترقی کی وزیر اسمرتی ایرانی نے جنوری ۲۰۱۶ء میں کہا تھا کہ علی گڑھ اور جامعہ کی

یونیورسٹیاں چونکہ پارلیمنٹ نے قائم کی تھیں اس لیے یہ اقلیتی ادارے نہیں ہیں۔ یہ کہتے وقت شاید ان کے ذہن میں ٹی۔ایم۔اے پائی کیس کا فیصلہ یا اس طرح کے دوسرے فیصلے نہیں تھے۔

اس کے علاوہ کسی ادارے کے اقلیتی کردار کو پرکھنے کا طریقہ صرف قانون کو دیکھنا نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلہ میں اس کے تاریخی پس منظر کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔ یہ نکتہ سپریم کورٹ کے ۱۹۹۳ء کے St.Stephens Case میں واضح کردیا گیا تھا۔ سپریم کورٹ نے St.Stephens College کو اقلیتی ادارہ مانا تھا کیونکہ اس نے اپنا عیسائی کردار برقرار رکھا تھا۔ جو اس کے نام، نشان، گرجا گھر اور یہاں دی جانے والی تعلیم سے عیاں ہے۔ اگر یہی طریقہ یہ طے کرنے کا ہے کہ کوئی ادارہ اقلیتی ہے یا نہیں تو علی گڑھ یونیورسٹی ایک اقلیتی ادارہ ہے۔ سپریم کورٹ بھی ۱۹۸۱ء میں یونیورسٹی کی جامع مسجد کی اہمیت کو مان کر اے۔ایم۔یو۔ کو اقلیتی کردار کو مان چکا ہے۔

اے۔ایم۔یو۔ کی ریزرویشن پالیسی: دھیرے دھیرے اے۔ایم۔یو۔ کی انتظامیہ کو احساس ہوا کہ اے۔ایم۔یو۔ میں اب سارے ہندوستان سے طالب علم نہیں آرہے ہیں اور اب صرف یوپی اور بہار کے طالب علم یہاں آرہے ہیں۔ اے۔ایم۔یو۔ میں ریزرویشن کا فائدہ بھی اب صرف یونیورسٹی کے ملازموں کے بچوں اور کچھ اے۔ایم۔یو۔ کے اسکولوں کے بچوں کو ہی ہو رہا تھا۔ اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ یونیورسٹی میں یہ رائے بنی کہ پورے ہندوستان سے ذہین مسلم طالب علموں کو اے۔ایم۔یو۔ میں لانے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ یہاں انٹرنل طالب علموں کی جگہ مسلم طالب علموں کے لیے ریزرویشن ہو۔ کچھ لوگ اس سے متفق نہیں تھے۔ لیکن ۲۰۰۵ء میں جب یہ ریزرویشن پالیسی نافذ کی گئی تو یہ ملک کی واحد ریزرویشن پالیسی تھی جس کا مقصد زیادہ ذہین اور اہل طالب علموں کی تلاش تھی۔ باقی سبھی ریزرویشن پالیسیاں کم اہل طالب علموں کو موقع فراہم کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔

نئی ریزرویشن پالیسی جس میں ۵۰ فیصد سیٹیں مسلمانوں کے لیے محفوظ تھیں کے لاگو ہونے کے بعد اے۔ایم۔یو۔ کے کچھ غیر مسلم انٹرنل طالب علم الہ آباد ہائی کورٹ چلے گئے۔ کورٹ نے کہا کہ مذہب کی بنا پر ریزرویشن کرنا غلط ہے جب کہ HRD منسٹری نے ایک نوٹس جاری کرکے اے۔ایم۔یو۔ کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ ۵۰ فیصد سیٹیں مسلمانوں کے لیے محفوظ کرسکتی ہے۔ اس مسئلہ پر

سپریم کورٹ ۱۹۹۳ء میں St.Stephens case میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ہے۔ اس نے یہ صاف کر دیا تھا کہ کسی ادارہ میں اس برادری کے لیے ۵۰ فیصد نشستیں محفوظ کی جاسکتی ہیں جس نے اسے قائم کیا ہے۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن غلط ہے اور اس لیے اے۔ ایم۔ یو۔ نے ایسا کر کے ہندوستان کے دستور کی خلاف ورزی کی ہے۔ لیکن یہ روک ریاستی اداروں پر لگائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اس طرح کا ریزرویشن دہلی یونیورسٹی میں نہیں ہوسکتا ہے۔ اقلیتی ادارے مذہبی ہوتے ہیں یا لسانی۔ زیادہ تر اقلیتی ادارے لسانی اقلیتوں کے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۰۰ سے زیادہ سندھی اقلیتی ادارے ہیں۔ اقلیت کی تعریف ریاست کی سطح پر کی گئی ہے۔ اس لیے اگر مراٹھی برادری اتر پردیش میں کوئی ادارہ قائم کرے تو وہ اقلیتی ادارہ ہوگا اور وہاں اس برادری کے لیے سیٹیں محفوظ کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح کا تحفظ دستور نے ہندوستان کے تنوع کو برقرار رکھنے کے لیے کیا ہے۔ کسی بھی برادری کی زبان و رسم الخط یا کلچر کا تحفظ کرنے کے لیے اقلیتی اداروں کی بہت اہمیت ہے۔ اقلیتوں کو حقوق ہندوستان میں سیکولرازم کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہیں۔ اکثریتی طبقے کو بھی کچھ خصوصی حقوق حاصل ہیں اور اس سے سیکولرازم کمزور نہیں پڑتا ہے۔ ہر سال 45.5 لاکھ روپے ہندو مندروں کی بحالی کے لیے Consolidated Fund of India سے دیا جاتا ہے۔ اس سے سیکولرازم مجروح نہیں ہوتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مقدمہ سپریم کورٹ کے سامنے ہے اور آنے والے وقت میں اس کا فیصلہ ہوجائے گا۔ لیکن اس مقدمہ نے اقلیتوں کے حقوق کے تعلق سے کئی سوال کھڑے کر دیے ہیں اور ایک عوامی بحث شروع کر دی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ جسٹس کھنہ کے الفاظ جو انہوں نے St.Xaviers College vs State of Gujarat میں کہے تھے، کہاں تک سچ ثابت ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا "جب تک ہندوستان کا دستور اپنے اصلی روپ میں زندہ ہے ان حقوق کے ساتھ کسی چھیڑ چھاڑ کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا ہے۔ ایسا کرنے کی کوئی بھی کوشش نہ صرف اعتماد کی خلاف ورزی ہوگی بلکہ وہ آئین کی خلاف ورزی ہوگی اور اسے عدالتیں رد کر دیں گی"۔

اخبار علمیہ

’’مفت تقسیم قرآن وحجاب پر پابندی کا بل‘‘

یورپی ملک آسٹریا کی برسر اقتدار پارٹی ایس پی اور او وی پی نے متفقہ طور پر اس بل کو منظوری دی ہے جس کے رو سے عوامی مقامات پر مفت تقسیم قرآن اور حجاب پر پابندی عاید ہوجائے گی اور عوامی نظام نقل و حمل، عدالتوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نقاب پہننے والی عورتوں کو ۱۵۰ یورو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ برقع اور قرآن کے نسخوں کی مفت تقسیم پر پابندی کا یہ قانون دراصل انضمام سے متعلق ایک جامع قانون کا حصہ ہے۔ ساتھ ہی مہاجرین کے انضمام کے لیے بارہ مہینہ کا ایک کورس بھی متعارف کرایا گیا ہے جس کو اسکولوں میں داخلہ کے وقت مکمل کرنا پڑے گا۔ اس نصاب میں نہ صرف مقامی زبان سکھائی جائے گی بلکہ مقامی رواج و اقدار کی تعلیم اور ملازمت کے لیے درخواست اور اپلائی کرنے کا طریقہ بھی بتایا جائے گا۔ اس نئے قانون کے تحت پناہ گزینوں سے عوامی کام بغیر تنخواہ کے بھی کروائے جاسکیں گے تاکہ انہیں روزگار کی آسٹرین منڈی کے لیے تیار کیا جاسکے۔ ریاستی سکریٹری کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد مہاجرین کو بہتر مستقبل فراہم کرنا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس منصوبہ میں شرکت سے انکار کرنے والوں کو ملنے والی سماجی و معاشرتی سہولتوں میں کمی بھی کی جاسکتی ہے۔ (جسارت نیوز، ۱۹؍ مئی ۲۰۱۷ء)

’’گربھ وگیان سنسکار پروجیکٹ‘‘

اس نام سے غیر مسلموں کی ایک تنظیم ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ اعلیٰ ترین نسل یعنی ایسے بچوں کی پیدائش وافزائش میں مدد کرے گی جن کی ذہانت اور رنگت ان کے والدین سے سوا ہوگی۔ تنظیم کی سربراہ کرشمہ موہن داس والدین کو مشورہ دیتی ہیں کہ وہ کس طرح تطہیر کے عمل سے گزر کر اپنی پسند کے ذہنی، جسمانی اور روحانی صفات کے حامل بچوں کی پیدائش کرسکتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا راز آیورویدمیں موجود ہے۔ اس گروپ نے گجرات میں ایسے دس طبی مراکز قائم کررکھے ہیں جن میں خالص قدیم ہندوستانی طبی طریقوں، خوراک، سیاروں اور ستاروں کی مدد سے علاج کیا جاتا ہے۔ ان مراکز نے اعلیٰ ترین نسل کے بچوں کی پیدائش کے لیے اب تک ۴ سو جوڑوں کا علاج کیا ہے۔ اس تنظیم سے وابستہ افراد کا کہنا ہے کہ وہ گجرات میں گزشتہ دس سال سے اس پر کام کررہے ہیں اور انہوں نے ۲۰۱۵ء میں اس کو قومی سطح پر متعارف کرایا ہے۔ اس کی سربراہ نے میڈیا میں اس بات کی تردید کی ہے کہ ان کا تعلق آر ایس ایس سے ہے البتہ اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ

آروگیہ بھارتی کے ساتھ کام کررہی ہیں۔اس کے علاوہ اس منصوبہ میں آرایس ایس کی تعلیمی ونگ ودیا بھارتی بھی ان کا تعاون کررہی ہے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال میں بھی اس کی شاخیں کھولنے کا ارادہ ہے۔آروگیہ بھارتی کے قومی سربراہ نے اس کا مقصد ''اتم سینانی'' یا اعلیٰ ترین نسل کے بچے پیدا کرنا بتایا ہے۔رپورٹ میں بین الاقوامی میڈیا کی جانب سے اس پر شدید تنقید کی جارہی ہے اور اس کو نازی جرمنی میں خالص آرین نسل کے بچوں کی پیدائش کی سماجی پالیسی کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔واشنگٹن پوسٹ نے بھی اس پروجیکٹ کو ہدف تنقید بنایا ہے۔(انڈین ایکسپریس بحوالہ انقلاب،۱۹رمئی ۲۰۱۷ء)

''کلام سیٹ''

رفعت شاہ رخ ایک مشہور ہندوستانی مسلم سائنس داں ہیں جن کی عمر ابھی ۱۸ برس ہے۔ان کا تعلق جنوبی ریاست تمل ناڈو کے ایک قصبے سے ہے۔اس وقت وہ راجدھانی چینئ میں اسپیس کڈز انڈیا کے رہنما سائنس داں کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ ادارہ ہندوستان کے بچوں اور نوجوانوں میں سائنس اور تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔ایک خبر کے مطابق انہوں نے ایک ایسا سیٹیلائٹ بنایا ہے جو دنیا کا سب سے ہلکا سیٹیلائٹ کہا جارہا ہے۔اس کا وزن صرف ۶۴ گرام ہے۔اس کو ایک مقابلہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ان کے بیان کے مطابق ان کی یہ ایجاد مدار کے ذیلی حصے کی پرواز پر چار گھنٹہ کے لیے جائے گی اور انتہائی کم قوت ثقل والے ماحول میں تقریباً ۱۲ منٹ اپنا کام کرے گی اسے پوری طرح اسکریچ سے تیار کیا گیا ہے۔اس میں ایک نئے قسم کا کمپیوٹر ہوگا اور آٹھ دیسی قسم کے سنسر ہوں گے جو رفتار، گردش اور قوت ثقل ناپیں گے۔اس سیٹیلائٹ کا نام مشہور عالم ہندوستانی سائنس داں اور سابق صدر اے پی جے عبدالکلام کے نام پر ''کلام سیٹ'' رکھا گیا ہے۔واضح رہے کہ اس سے قبل انہوں نے ''ہیلیم ویدر بیلون'' کی ایجاد ۱۵ برس کی عمر میں ملکی سطح کے مقابلے کے لیے کی تھی۔(تفصیل بی بی سی اردو ڈاٹ کام،۱۶رمئی ۲۰۱۷ء کی اشاعت میں دیکھی جاسکتی ہے)

''عمان میں جدید ترین تحقیقی مرکز کا افتتاح''

اردن کے دارالحکومت عمان کے شمال میں ۳۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک جدید سائنسی مرکز کے افتتاح کی خبر ہے۔بیس سال قبل اس کے قیام کا خیال پیش کیا گیا تھا اور اس وقت سے اس پر کام چل رہا تھا۔اس تحقیقی اور سائنسی مرکز کا نام ''کھل جا سم سم'' رکھا گیا ہے۔یہ مشرق وسطیٰ میں سیاسی کشیدگی اور جنگ کے ماحول کے بیچ باہم ایک دوسرے کے مخالف ممالک کی مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں وجود میں آیا۔اس مرکز میں ایٹمی ذرات کو متحرک کرنے والا سنکروٹرون ہے جو انتہائی طاقتور خوردبین کے طور پر کام کرتا ہے۔محققین میں ایران،

اسرائیل اور فلسطین کے سائنس داں شامل ہیں۔اس میں موجود سنکروٹرون سے کینسر زدہ خلیوں سے لے کر قدیم پارچہ جات اور پودوں کے امراض کی تشخیص بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔علاقے کی حساسیت اور اخراجات میں کمی اس کی تعمیر میں تاخیر کا سبب ہوئی۔ برطانوی سائنس داں پروفیسر سر کرس لونین اسمتھ انتہائی مشکل حالات میں اس منصوبہ کی تکمیل میں لگے رہے۔اسرائیل اور ایران اور ترکی و قبرص کے باہم سفارتی تعلقات کی ناہمواری بھی اس پروجیکٹ پر اثر انداز رہی۔رپورٹ میں یہ بات بھی درج ہے کہ دنیا کے تقریباً ۶۰ سنکروٹرونز میں سم سم مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہے۔جس کا مقصد اس علاقے میں باصلاحیت لوگوں کو یورپ اور امریکہ جانے سے روکنا ہے۔افتتاحی تقریب میں اردن، قبرص، مصر، ایران، اسرائیل، پاکستان، فلسطین اور ترکی کے مندوبین کے علاوہ سرن، یونیسکو اور آئی اے اے کے سربراہان کی شمولیت متوقع ہے۔

(یہ خبر بی بی سی اردو ڈاٹ کام، ۱۶؍مئی ۲۰۱۷ء کی اشاعت میں موجود ہے)

’’۳۷ سالہ معمر خاتون کا حفظ قرآن‘‘

الجزائر سے تعلق رکھنے والی ام مصنف حاجیہ خدیجہ نے ۳۷ برس کی عمر میں حفظ قرآن مکمل کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔۴۹ برس کی عمر سے جب انہیں گھریلو یا عائلی کاموں سے فرصت ملی تو حفظ کرنا شروع کیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے بچپن میں نہ تو ناظرہ اور نہ ہی قاعدہ پڑھا تھا۔اس لیے سن کر حفظ کرنا شروع کیا۔ان کے بیان کے مطابق ابتدا میں چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کی۔اس کے بعد بڑی بڑی سورتیں ٹیپ ریکارڈ سے مسجد نبوی کے امام وخطیب شیخ عبدالرحمٰن الحذیفی کی آواز میں سن کر یاد کر ڈالیں تاہم انہیں دیکھ کر پڑھ نہیں سکتی اور نہ ہی یہ بتا سکتی ہیں کہ سورۃ البقرہ، النساء اور یٰسین وغیرہ کیسے لکھی جاتی ہے۔ان سے پوچھا گیا کہ اس جانب آخری حصہ عمر میں کیوں متوجہ ہوئیں اور پہلے اس کا آغاز کیوں نہیں کیا تو جواب دیا کہ بچپن میں والدین نے اس طرف راغب نہیں کیا۔شادی کے بعد بچوں کی پرورش میں مصروف ہوگئی۔اگر اس وقت اس جانب ملتفت ہوتی تو گھریلو زندگی میں خلل واقع ہوتا۔انہوں نے مزید کہا کہ گھر والوں کو میرے حفظ کی اطلاع تھی لیکن میں نے تکمیل کی بات پوشیدہ رکھی تھی۔کچھ عرصہ پہلے میں نے مسجد کے امام صاحب کو مطلع کیا کہ میرے حفظ کی تکمیل میں ایک تقریب کا اہتمام کریں۔تقریب شروع ہوئی تو میں اپنی لاٹھی کے سہارے مسجد پہنچ گئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ جس ’’بچی‘‘ کے حفظ کی تکمیل میں اس پروگرام کا انعقاد کیا گیا ہے وہ میں ہوں تو بچوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔بچے مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔بڑی بی کے حفظ کو دیکھ کر ان کے شوہر نے بھی حفظ شروع کردیا ہے۔(تفصیل منصف حیدرآباد، ۱۳؍مئی ۲۰۱۷ء کے شمارہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)

ک۔ص۔ اصلاحی

آثار علمیہ و تاریخیہ

تعارف ’’نو وارد شاعر‘‘

سید سلیمان ندویؒ

نوٹ از: سید سلمان ندوی، ڈربن، ساؤتھ افریقہ

’’میں نے جگر صاحب کو سب سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تعلیم کے زمانہ میں ۱۹۴۳ء میں ندوۃ العلماء کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ بڑے طلبہ نے جمعیۃ الاصلاح کے ہال میں ایک مشاعرہ کی نشست کا اہتمام کیا تھا اسی سلسلہ میں جگر صاحب کی آمد ہوئی تھی۔ مسجد میں ایک نئی شخصیت نظر آئی۔ چھریرا بدن، قراقلی ٹوپی، سیاہ شروانی، چست پاجامہ۔ ایک عجیب دل نواز کشش تھی۔ اس سراپا میں اس وقت مشاعرہ اور شاعری سے محظوظ ہونے کا سلیقہ بھی نہیں تھا مگر اتنا تھا کہ جب جگر صاحب ترنم سے اشعار پڑھ رہے تھے تو داد کی برسات ہو رہی تھی اور مجھے ان کا ترنم بہت اچھا لگا تھا۔

گرمی کی تعطیل غالباً ۱۹۴۵ء میں جگر صاحب سے براہ راست تعارف اس طرح ہوا کہ وہ دارالمصنّفین شبلی منزل میرے والد ماجدؒ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اس مجلس میں اقبال سہیل صاحب (مشہور شاعر، مولانا شبلی نعمانی کے شاگرد اور مشہور وکیل) اور عبدالسلام ندوی صاحب بھی تھے۔ جگر صاحب حسب فرمائش اپنی مسحور کن آواز میں غزل پڑھ رہے تھے، اس وقت تو اتنا ہوش نہ تھا کہ غزل یاد رہے۔ اسی زمانہ میں جگر صاحب کی شراب سے توبہ کی بڑی شہرت ہوئی تھی اور ہر شخص کی زبان پر اس کے اشعار تھے۔ ایک مصرع ذہن میں چپک گیا تھا۔ توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرّا کے پی گیا

۱۹۴۵ء کی اس ملاقات کے بعد جگر صاحب یاد رہے اور ایک دن اتفاقاً والد ماجدؒ کی میز پر جگر صاحب کا مجموعۂ کلام ''شعلۂ طور'' (مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ) نظر آیا۔ اس کی جلد سیاہ اور بہت دیدہ زیب تھی۔ اس مجموعہ پر جگر صاحب کا نام دیکھا تو بہت دلچسپی ہوئی۔ شعلہ طور کے ابتدائی صفحہ پر والد ماجدؒ کا مقدمہ ''تعارفِ نو وارد شاعر'' (تحریر کردہ ۷؍ مئی ۱۹۳۲ء) دیکھا تو اور بھی دلچسپی ہوئی۔ پورا تعارف ایک ہی نشست میں پڑھ گیا اور بہت مزہ آیا کیونکہ جس شاعر کا تعارف تھا اس سے میں واقف ہو چکا تھا۔ اس تعارف کے بعض جملے ذہن میں پیوست ہو گئے تھے مثلاً ''جگر جہاں کھڑا ہے تنہا کھڑا ہے، جگر مست ازل ہے اس کا دل سرشار اَلست ہے''۔

اب جب کہ میں گذشتہ ۴۵ سال سے جنوبی افریقہ کے ڈربن شہر میں مقیم ہوں اور اس سے پہلے تقریباً ۱۵ سال کا زمانہ امریکہ میں تعلیم و تدریس میں گذرا شعر و سخن سے دلچسپی قائم رہی۔ شاعر تو نہیں ہوں مگر شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ اقبال اور جگر صاحب کا مجموعہ کلام ہمیشہ میرے پاس سفر و حضر میں ساتھ رہتا ہے۔ ''آتشِ گل'' اور ''شعلۂ طور'' کے اشعار دہراتا رہتا ہوں۔ ایک دن اچانک شعلۂ طور کے ''تعارف'' کی سطریں جو مجھے یاد تھیں، وہ یاد آ گئیں اور بے ساختہ پورے تعارف کو پھر پڑھنے کی طلب ہوئی اور یہ طلب بہت تیز ہوئی تو خیال آیا کہ دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں یہ مجموعہ ہوگا اور اس مقدمہ کو منگوا لوں۔ ناظم دارالمصنّفین ڈاکٹر اشتیاق ظلی صاحب کو ان کی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کی وجہ سے تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اشتیاق صاحب کی مہربانیوں سے پہلے ہی زیر بار ہوں۔ رفیق دارالمصنّفین عزیز گرامی عمیر الصدیق صاحب کا فون نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ تو اچانک مجھے اپنے عزیز فاضل دوست ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب اصلاحی کا خیال آیا کہ ان سے مدد لی جائے۔ مجھے اس کی اطلاع تھی کہ ظفر الاسلام ایک موٹر کار کے حادثہ میں زخمی ہو کر گھر پر ہی محصور ہیں اور تقریباً صحت یاب ہیں۔ ہمارے ظفر الاسلام صاحب جب بھی میں علی گڑھ جاتا ہوں تو وہ وہاں میرے مرشد ہوتے ہیں۔ حادثہ میں زخمی ہو کر ان کو سخت چوٹیں آئی تھیں مگر اب اس قابل تھے کہ میری مدد کر سکیں۔ چنانچہ میں نے ظفر الاسلام صاحب

سے جو میرے ہر مرض کی دوا ہیں رابطہ کیا اور فرمائش کی کہ دارالمصنّفین سے ''شعلۂ طور'' کا نسخہ حاصل کرکے والد ماجدؒ کے تعارف کی نقل مجھے روانہ کردیں۔ظفرالاسلام صاحب نے اطلاع دی کہ شعلہ طور کا وہ نسخہ وہاں کتب خانہ میں موجود نہیں ہے جس میں والد ماجد کا تعارف شامل ہے۔حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ وہاں کتب خانہ میں یہ نسخہ نہیں ہے۔پھر مجھے خیال ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کسی نہ کسی لائبریری میں ضرور موجود ہونا چاہیے۔ظفرالاسلام بھی تلاش میں لگے رہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نوادرات کی لائبریری (مولانا آزاد لائبریری) میں نہیں تھا۔بالآخر ''ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں'' کے مطابق ظفرالاسلام کو یہ تعارف میرے عزیز کرم فرما حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کے ''عجائب خانہ'' (ابن سینا اکیڈمی) میں دستیاب ہوا۔حکیم صاحب خود ''مجموعۂ عجائب'' ہیں۔علی گڑھ جب بھی جانا ہوتا ہے تو ان سے ملاقات کا داعیہ سرفہرست ہوتا ہے۔ان کی کرم نوازیوں نے زیر بار کر رکھا ہے۔جب بھی ان کے دولت کدہ میں حاضری ہوتی ہے تو اپنے عجائب خانہ کا ''طواف'' ضرور کراتے ہیں اور جب بھی زیارت ہوئی ہر بار نئی دریافت کی زیارت ہوتی ہے۔حکیم صاحب خود بھی پرانی لکھنوی تہذیب کے نمایندہ ہیں اور مروت و اخلاق کا آئینہ ہیں۔اس ''عجائب خانہ'' کی ہر چیز ان کو ازبر ہے اور بڑی دلچسپی سے اس کی تاریخ بتاتے ہیں۔بہت بڑا علمی خزانہ ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ان کو صحت کے ساتھ عمر طویل سے نوازے اور یہ بھی کہ اس قیمتی سرمایہ کی نگہداشت اور اس کی حفاظت ان کے صاحبزادے (ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن) بھی اسی تندہی کے ساتھ انجام دیں گے۔بہرحال ''شعلۂ طور'' ان کے خزانہ سے دستیاب ہوا اور ظفرالاسلام کے توسط سے ''تعارفِ نووارد شاعر'' کی اسکین کاپی بذریعہ ای۔میل مجھ تک پہنچی۔حکیم صاحب کی فیاضی اور وسعت قلب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے نہ صرف ذاتی طور پر دلچسپی لے کر نسخہ نکالا، بلکہ موبائل سے اس کا فوٹو لینے کی اجازت بھی دی۔حکیم صاحب کی خدمت میں جگرؔ ہی کا یہ شعر ہدیہ ہے:

عشق اور گوارا خود کرلے بے شرط شکست فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش ہے تنہا یہ نظر کا کام نہیں

"شعلۂ طور" کے مقدمہ یا تعارف کے حصول میں ایک دوسری شخصیت ڈاکٹر ابوذر متین (شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی ہے۔انہوں نے موبائل کے ذریعہ اس تعارف کی تصویر ظفرالاسلام کومہیا کی اور اپنا قیمتی وقت لگا کر میری خواہش کی تکمیل کی۔ میں ابوذر صاحب کا ممنون ہوں اور بہ شرط حیات اگر موقع ملا تو براہ راست ان سے اپنی احسان مندی کا ذکر کروں گا۔

جگر صاحب سے کئی بار ملاقات کا اور ان سے سننے کا موقع ملا۔جگر صاحب بہت بااخلاق تھے اور جس سے جو تعلقات تھے اس سے اپنے تعلقات کا ہمیشہ خیال رکھا۔والد ماجدؒ سے تو ان کو عقیدت تھی اور اس تعلق کو انہوں نے زندگی بھر نباہا۔والد ماجدؒ جہاں جہاں بھی رہے وہ اگر اس جگہ آتے تو ضرور ملنے کے لیے آتے۔ والد ماجدؒ کے بھوپال کے زمانۂ قیام میں ۱۹۴۸ء میں جگر صاحب بھوپال آئے تو والد ماجدؒ سے ملنے آئے تو والد صاحب کی فرمائش پر غزل سنائی اور حسب معمول اپنے مسحور کن ترنم میں اپنی مشہور غزل سنائی جس کا مطلع یہ ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

ان کا ترنم ابھی تک کانوں میں گونج رہا ہے۔والد ماجدؒ کا انتقال ۲۲ رنومبر ۱۹۵۳ء کو ہوگیا تو جب جگر صاحب ۱۹۵۴ء کے شروع میں کراچی آئے تو تعزیت کے لیے ہم لوگوں کے پاس ہمارے گھر آئے۔ یہ "وفاداری بہ شرط استواری" کا کچھ کم ثبوت نہ تھا۔ پھر میری آخری ملاقات جگر صاحب سے لکھنؤ میں ۱۹۵۹ء میں جون یا جولائی میں ہوئی۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لکھنؤ اپنے بہنوئی اور ہمشیرہ سے ملنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ جگر صاحب کا قیام لکھنؤ میں اپنے دوست سید صدیق حسن صاحب کمشنر لکھنؤ کے یہاں ہوا کرتا تھا۔جگر صاحب کو میری والدہ کے آنے کے بارے میں معلوم ہوا تو گھر پر ملنے آئے۔ بیماری اور عمر نے ان کو کمزور کردیا تھا۔سیڑھی سے اترتے وقت میں نے ان کو سہارا دینے کے لیے بازو پکڑا تو ہڈی کے علاوہ گوشت نہ تھا۔ یہ تھی جگر صاحب کی وضع داری۔

۱۹۶۰ء میں جگر صاحب کے انتقال کی خبر ملی اور ان سے تعلقات کی پوری داستان میرے ذہن ودماغ میں پیوست ہوکر محفوظ ہوگئی۔

جان کر من جملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے"

اللہ اکبر! بارہ چودہ برس گزرتے بھی کچھ دیر لگتی ہے۔ بڑی لڑائی کی ہولناکی ختم ہوچکی تھیں مگر اس کے آثار اس وقت تک نمایاں تھے۔

ایک صاحب عینکوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے اکثر سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں سے ملنے جایا کرتے تھے اور ان میں سے ایک کی خبریں دوسروں کو پہنچایا کرتے تھے، اسی سلسلے میں وہ ایک طرف ایک قیدی کے پاس رانچی اور دوسری طرف ایک آزاد کے پاس اعظم گڑھ آیا کرتے تھے اور ایک کو دوسرے کی نسبت معلومات دیا کرتے تھے اور اس حیثیت سے غالباً کسی سیاسی حسنِ ظن کی بنا پر وہ اکثر آمدورفت کی نوازش فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ آئے تو اپنے ساتھ ایک نیا تحفہ لائے یعنی ایک شاعر۔

اعظم گڑھ ہے تو ایک چھوٹا سا شہر اور دور اُفتادہ بھی مگر لوگ کبھی کبھی افتاں وخیزاں یہاں پہنچ ہی جاتے ہیں اور کچھ قدردان بھی ان کو یہاں مل جاتے ہیں۔ خصوصاً مولانا سہیل اور مرزا احسان احمد جیسے قدرشناس جوہری بھی پورب کے اس اجڑے دیار میں آباد ہیں اور ساکنین شبلی منزل کا کیا کہنا کہ وہ تو یہاں کے اندھوں میں راجہ بنے بیٹھے ہیں۔

یہ نیا تحفہ ایک نوجوان شاعر تھا۔ ہمہ صفت شاعر، پریشان مُو، پریشان حال، پریشان دل۔ ہمارے قدیمی عنایت فرمانے اپنے دوست کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شاعر بھی ہیں۔ اس وقت حاضرین میں مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اور دوسرے کمرے میں جہاں آواز جاسکتی تھی پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر سخن فہمی کا مدعی اور موجودہ شعراء کے ہر عیب وہنر سے واقف۔ ان عنایت فرما کے اس تعارف نے گدگدی پیدا کی اور جی چاہا کہ شاعر صاحب سے کچھ سنا جائے اور ان کے اس دعوائے سخنوری کا امتحان لیا جائے۔ سب کی

نظریں ایک خاص نگاہِ تبسم کے ساتھ شاعر کے چہرے کی طرف اٹھیں مگر اس نے اس ماحول سے بے پروا ہو کر ایک عجیب درد انگیز ترنم، مست لہجے اور سرشار انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا۔ ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا۔ ذہن کی رو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا۔ تبسم کی نگاہ میں تحیّر پیدا ہوا۔ سامعین کے لبوں میں لرزش آواز میں اور آوازِ احسنت و مرحبا کی صدائے تحسین میں بدل گئی۔ اب تو شاعر کی نسبت جلدی جلدی اپنی رائیں بدلنی پڑیں اور انکار رفتہ رفتہ مگر تیزی کے ساتھ اعتراف کی صورت میں بدلنے لگا اور تھوڑی دیر میں شبلی منزل کے چھوٹے سے ہال میں شاعر کے تموج آفریں ترنم کے سوا ہر آواز ساکت اور ہر جنبش ساکن تھی۔

اختتام محفل پر یہ صاحب اٹھ کر گئے تو ہر ایک نے اپنی اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ جو لوگ ہمارے پروفیسر عبدالباری (عثمانیہ یونیورسٹی) کو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کس قدر مشکل پسند اور کس دشواری سے کسی پر ایمان لانے والے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ”صاحب اس نے کمال کیا ہے“۔ اب شہر میں اس شاعر کی شہرت ہوئی۔ کسی کو اس صاحبِ کمال کے کمال پر یقین آ گیا تھا اور کوئی اب تک منکر تھا۔ اس پر تو بہرحال سب کو یقین تھا کہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ یقیناً انمول موتی ہیں، مگر ان گوہر ہائے شاہوار کا مالک بھی یہی فقیر دلق مرقع ہے، اس میں بہتوں کو شک تھا۔

آخر اس کے امتحان کا بھی دن آ گیا، ایک مشاعرہ کا میدان ترتیب پایا۔ بڑے بڑے پہلوانِ سخن جو بار بار علی گڑھ کے معرکے جیتے ہوئے تھے، پنجہ کشی اور زور آزمائی کے لیے قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھے اور زورِ سخن کے نئے نئے کرتب دکھائے۔ آخر میں وہ لاغر اندام نو وارد، پہلوانی کے ہر گُر سے ناواقف، نمائش اور داد طلبی کی ہر ادا سے بے نیاز، دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود سراپا اثر بن کر جب سامنے آیا تو مصر سخن کے سب جادوگر بیک وقت چلا اٹھے اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى۔ یہ کلیم سخن کون تھا؟ جگر مرادآبادی۔ پھر کیا تھا حریفوں نے دوست سے بڑھ کر دوست اس کو بنایا، مشاعرے پر مشاعرے ہونے لگے۔ شاعر ایک تھا مگر اس کے اثر نے ہر خاموش کو شاعر اور ہر شاعر کو خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ آخر اعظم گڑھ اور شبلی منزل کی یہی تحسین و آفریں تھی جو داغِ جگر کی دل پذیر شکل میں ملک کے سامنے آئی اور سب نے جگر کو جگر جانا۔

جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر، بلکہ ہمہ شاعر، ان کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے

الگ، لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق اور آورد سے پاک، طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا۔ موجودہ شعراء میں اس کے اس وصف میں اگر کوئی شریک ہے تو وہ فانیؔ ہے سادگی اور بے تکلفی حسرتؔ کی بھی خصوصیت ہے، مگر اس کی سادگی میں کشش ہے، بناؤ نہیں۔ جگر کا کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود اس میں بے حد فطری آرائش اور از خود نمائشِ حسن ہے۔

معنوی لحاظ سے جگر جہاں کھڑا ہے تنہا کھڑا ہے، سرمستی اور سرشاری، تاثر اور دل فگاری اس کے ہر مصرع کی جان ہے، اس کا یہ اثر اس لیے نہیں کہ واعظین خوش مقال کی طرح وہ مجلس کو رلانے کے لیے شہدائے کربلا کے دامن میں پناہ لے، یا آج کل کے بعض طالب اثر شاعروں کی طرح نہیں جو لاش و مدفن و سورۂ یٰسین و نوحۂ بین و میت و نزع وغیرہ کا ایک تیر کمند مفت پھینک کر بالقصد مرغ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں اور آخر لسان الغیب حافظ کا طعنہ سنتے ہیں:

برو ایں دام بر مرغ و گر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں وہ انہیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں مگر وہ جب کہتے ہیں سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ ہر فطری شاعری کا رنگِ مذاق یہی ہوتا ہے کیوں کہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے۔ وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے تراوش کرتا ہے، اسی طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا جو ہر جگہ وہ یکساں ہی ظاہر ہوگا۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے دل کی نہیں دوسروں کی کہتے ہیں وہ ہر رنگ محفل اور ہر ذوقِ دل کی نمایندگی کرتے ہیں مگر وہ اس لحاظ سے شاعر نہیں، بلکہ پیشہ ور خطیب و واعظ ہیں۔ فارسی غزل کا بہترین نمونہ حافظ کا کلام ہے مگر ان کو ہر صاحبِ نظر محسوس کرتا ہوگا کہ حافظ کے خیالات میں نیرنگی نہیں، طرز بیان میں نیرنگی ہے۔ یعنی وہی چند بندھے ہوئے خیال ہیں جو حافظ کی ہر غزل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر ہر غزل اپنے طریق اظہار اور طرز تعبیر میں الگ ہے، ایک ہی خیال سو سو طرح اس میں ادا ہوتا ہے مگر ہر جگہ اس کی شان نرالی اور طرز نئی ہے، یہی حال خیامؔ کی رباعیوں کا ہے،

چند خیالات ہیں جو ہر دفعہ نیا قالب بدل کر اور نئی شکل میں جلوہ گر ہو کر سامنے آتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ یہ وہ شاعر ہیں جو الفاظ و تراکیب کے حسن کے باوجود صرف ان چیزوں کو کمال نہیں جانتے، بلکہ ان کے اندر چند حقیقتیں مرکوز رہتی ہیں۔ وہی رہ رہ کر ابھرتی اور نالۂ موزوں کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوس بالائے بام، نہ شکایتِ منظرِ عام۔ اس کے کاشانۂ خیال میں چشم ہائے بسمل کی آئینہ بندی ہے، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچے میں شہداء کے دل و جگر کی گل کاری ہے۔ وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاقِ نظر ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہیں اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب دکھا دیتی ہیں تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے۔

جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے۔ وہ محبت کا متوالا ہے اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانے کی گلی سے کعبے کی شاہ راہ کو اور خم خانے کی بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر پیکر بزم ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے۔

جگر بہ ظاہر سرشار مگر در حقیقت بیدار ہے۔ اس کی آنکھیں پُر خمار، مگر اس کا دل ہوشیار ہے اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں یہ اثر نہ ہو۔

دوستاں عیب نظر بازی حافظ مکنید
کہ من او را از محبانِ خدا می بینم

سید سلیمان ندوی
شبلی منزل، اعظم گڑھ
۷ رمئی، ۱۹۳۲ء

وفیات

مولانا محمد سعید میاں مجددیؒ

(۱۹۳۸ء۔۲۰۱۷ء)

بھوپال بلکہ ایک عالم کے لیے مولانا محمد سعید مجددی کی رحلت کی خبر مغموم واداس کرنے والی تھی، وہ ۳۰؍مارچ کی شام اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی وفات سے علم وحکمت اور اصلاح وتربیت کی وہ روشنی بھی جاتی رہی جو بھوپال کی خانقاہ مجددیہ میں قریب دوسو سال سے نور وسرور کی ضامن تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی کے کار تجدید کی مقبولیت کا غیر معمولی ہونا ظاہر ہے، برصغیر کی سرحدوں سے آگے سلسلہ مجددیہ کی فتوحات کی ایک تاریخ ہے لیکن بھوپال کی خانقاہ مجددیہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ یہاں نسبت اور نسب دونوں کا اجتماع تھا۔ ۱۲۳۳ھ میں شاہ رؤف احمدؒ بھوپال تشریف لائے جن کا سلسلہ نسب چار واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند اصغر خواجہ محمد یحییٰ سے ملتا ہے۔ شاہ رؤف کے پوتے شاہ پیر احمد تھے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے کبار مشائخ میں تھے اور ان کے عہد میں ہندوستان میں نسبت مجددیہ کا ان سے بڑھ کر مظہر اور معارف وحقائق میں ان سے بڑا ترجمان کوئی اور نہیں تھا۔ ان کی اولاد میں شاہ یعقوب مجددیؒ نے خانقاہ کی ان روایات کو بطریق احسن زندہ وقائم رکھا جو توکل، استغنا، بے لوثی اور خاموشی وگم نامی سے عبارت ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا محمد عمران خاں ندوی رحمہم اللہ پوری ملت کی جانب سے شکریہ واحسان کے مستحق ہیں کہ ایک دنیا حضرت شاہ یعقوب مجددیؒ کے حکیمانہ اقوال سے مستفید ہوئی، جن کی نظر واقعی نظر ہے انہوں نے شاہ یعقوب مجددی کی زندگی میں حضرت مجدد الف ثانی کے کار تجدید کا پرتو دیکھا اور بجا طور پر محسوس کیا کہ اس عکس تجلی میں نسبت فرزندی کا بھی دخل ہے۔

مولانا محمد سعید مجددی ان ہی شاہ یعقوب مجددیؒ کے فرزند تھے۔ ۱۹۳۸ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے، تعلیم وتربیت کے لیے خانقاہ ہی کافی تھی، رسمی بھی اور حقیقی بھی۔ شاہ یعقوب مجددی نے ایک بار

فرمایا کہ میں نے تو سترہ برس حیدرآباد میں جوار کی روٹی کھا کر بسر کی، اگر مجھ میں یہ دردوسوز پیدا ہوا تو تعجب نہیں لیکن محمد سعید پر مجھے تعجب ہے کہ وہ نہ کہیں گئے نہ آئے نہ یہ محنت کی ان میں یہ محبت وجذبہ کیسے پیدا ہو گیا۔ اصل تعلیم تو وہی جو دل کو درد کی دولت دے دے۔ مولانا محمد سعید مجددی کو یہ دولت ملی اور خوب ملی، للّٰہیت، معرفت کا اندازہ تو وہی لگا سکتے ہیں جو ان خوبیوں کے عارف ونباض ہوں، عامیوں کے لیے تو وہی شخص خاص ہے جو معصوم صفت ہو، سادگی وفروتنی کا پیکر ہو، تواضع وانکسار کے اس مقام پر ہو جہاں چھوٹوں کو بھی ایک لمحہ کے لیے ہی سہی، بلندی کا احساس ہو جائے، جس کی گفتگو کی نرمی اس کے دل کی گرمی کا نتیجہ ہو، مولانا محمد سعید مجددی کی شخصیت ان خوبیوں کا خوبصورت وکامل ترین آئینہ تھی۔ بھوپال والوں کے لیے وہ سعید میاں یا صرف میاں تھے، عقیدت ومحبت اگر ورثہ میں ملتی ہو تو اس کو برقرار رکھنا ہی ایک کام ہے۔ اگر اس میں ازدیاد واضافہ ہو تو اس کو بس عنداللہ مقبولیت ہی کہا جا سکتا ہے۔

سعید میاںؒ کی یہی مقبولیت تھی جو دوسروں کے لیے کشش میں بدل گئی، خانقاہ میں اپنی ایک الگ دنیا سے سروکار رکھنے والے کے لیے اسی کشش نے اثر دکھایا، وہ مدھیہ پردیش وقف بورڈ کے چیرمین بنائے گئے، ندوۃ العلماء اور دارالمصنّفین کے ایسے رکن ہوئے جن سے خود رکنیت کو عزت ملی، مسلم پرسنل لا بورڈ اور مجلس ادب اسلامی کو بھی ان کی سرپرستی کا اعزاز حاصل ہوا، لیکن سب سے بڑھ کر ان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جو انہوں نے خانقاہ سے نکال کر دارالعلوم تاج المساجد کو نذر کیا، تاج المساجد اگر فخر بھوپال ہے تو اس کا دارالعلوم بھی وسط ہند کا دیوبند وندوہ ہے۔ شاہ یعقوب مجددی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی دعائیں اور مولانا محمد عمران خاں ندوی کی زندگی دارالعلوم تاج المساجد کے لیے وقف ہوئی، لیکن مولانا ندوی کے بعد ان اداروں کی زندگی میں ایک بڑا سخت وقت آیا، ایسے میں سعید میاںؒ کی توجہ اور احساس ذمہ داری نے جس طرح مسجد ودارالعلوم کی حفاظت اور ترقی کی فکر کی، اس کی قدر تو بھوپال والوں کے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ جو بھوپال سے دور ہیں لیکن اسلامی اداروں سے دردمندی و فکرمندی کا تعلق رکھتے ہیں وہ اگر اس کو سعید میاںؒ کی کرامت سمجھیں تو یہ کوئی غلو اور مبالغہ نہ ہوگا۔ ایک نحیف جثہ میں مقاومت کی ایسی قوت واستقامت کو اور کہا بھی کیا جائے۔

اصل یہی ہے کہ استقامت اور اپنی جگہ قیام واستقرار، سلسلہ مجددیہ کی خاص خوبیوں سے ہے۔ جدت وتجدید کے معانی بھی اس کی شناخت میں معاون ہوتے ہیں، خانقاہ مجددیہ بھوپالیہ کے

بارے میں مولانا علی میاںؒ نے فرمایا تھا کہ ''یہ خانقاہ ان تمام رسوم پابندیوں اور طریقوں سے دور ہے جو عام طور پر دوسری خانقاہوں کی زندگی کالازمہ وعلامت ہیں، نہ لنگر، نہ مہمانوں کی دھوم دھام، نہ عرس وفاتحہ کا اہتمام، نہ اوقات کا انتظام وانصرام''۔ سعید میاںؒ کو جنہوں نے دیکھا وہ اس قول کی صداقت کی شہادت دیں گے کہ قرآن مجید کے طبعی ذوق، حدیث وسیرت کے مسلسل مذاکرہ نے ان کی شخصیت کو جدت وتجدید کے اسی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ یکتائی وتنہائی خدا جانے خاموشی ودل سوزی کی کتنی منزلوں سے آشنا کراتی ہے، پیر سعید میاںؒ کے دل کی انگیٹھی کبھی سرد نہیں ہوئی، عربی اور اردو میں شاعری کے وسیلہ سے آتش خموش کو وہ ہوا دیتے رہے، ان کی بعض نعتیں بھوپال کی دینی مجالس کا حصہ بن گئیں، تحفۂ اشعار، قصیدۂ شہودیہ، تحفۂ معجزات، مناجات وغیرہ آج بھی بھوپال کی فضاؤں کو معطر کرتی رہتی ہیں۔ معطر تو دارالمصنّفین بھی ان کے انفاس مبارکہ سے ہوتا رہا، وہ مجلس انتظامیہ کے رکن رکین تھے اور جلسہ انتظامیہ کی صدارت بھی فرماتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی زیارت تو انہوں نے آغاز عمر ہی میں کر لی تھی، خطبات مدراس کا عربی ترجمہ کر کے سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور اصلاح بھی لی۔ سید صاحب اور مولانا محمد عمران خاں ندوی سے تعلق نے دارالمصنّفین کے لیے ان کے دل وزبان پر دعائیں جاری کیں، ادھر کئی برسوں سے وہ تشریف نہیں لاسکے لیکن بھوپال میں وہ تفصیل سے دارالمصنّفین کی خیریت دریافت کرتے، محترم ظلی صاحب کے نفیس ونستعلیق ذوق کی ہمیشہ داد دیتے۔ فرماتے کہ حالات کی سختی اور ہے، سلیقہ مندی اور۔ ان کا انداز گفتگو بھی کیا خوب تھا، اپنے مقدس ہاتھوں میں دوسروں کے آلودہ ہاتھوں کو لے کر ایک ذرا خم ہو کر جب وہ نصیحت فرماتے تو معاملہ ہی کچھ اور ہوتا، صحت کے لیے ایک بار فرمایا کہ میاں دو چیزیں خالص ہونا ضروری ہیں یعنی الھواء والغذاء، کیا انداز تھا شاید یہی انداز تھا جس نے کبھی جلال الدین محمد اکبر کی رعونت کو پاش پاش کر کے اورنگ زیب کو شہزادہ دین پناہ کی شکل میں پیش کر دیا۔ یقین ہے کہ حضرت مجدد کے سلسلہ کے فیوض وبرکات جاری رہیں گے، اللہ تعالیٰ پیر سعید میاںؒ کے درجات کو بلند فرمائے اور بھوپال اور ہر اس ادارہ کو جس سے ان کا تعلق تھا، ان کا بدل عطا فرمائے، نعم البدل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

ع۔ص

ادبیات

غزل

جناب الطاف احمد اعظمی

دل میں ہے اضطراب تو آنکھوں میں نم بہت
یاد آرہا ہے آج کسی کا ستم بہت

چپ ہوگئے ہیں دیکھ کر انجامِ آگہی
رکھتے تھے دل میں خواہشِ لوح و قلم بہت

دعویٰ نہیں ہے پاکیِ داماں کا ہاں مگر
باندھا ہے ہم نے قلب و نظر کا بھرم بہت

کیا دور ہے کہ لب پہ رواں حرفِ انکسار
لیکن درونِ قلب میں ہے شورِ ''ہم'' بہت

کارِ خرد میں دستِ جنوں بھی شریک ہو
زلفِ حیات میں ہے ابھی پیچ و خم بہت

شاید اسی کا نام ہے مرگِ ضمیر و دل
ہر سمت ہے فشارِ زبان و قلم بہت

دو گھونٹ مے پلا کے سجاتے ہیں بزمِ داد
دیکھے ہیں ہم نے ایسے بھی اہلِ کرم بہت

سچ بولنے کا اس کے سوا اور کیا صلہ
اپنے ہی گھر میں کھائے ہیں سنگِ ستم بہت

اہلِ طرب کو ہوش کہاں ، ان کو کیا خبر
جلتے ہیں بستیوں میں چراغِ الم بہت

احمدؔ سراغ مل نہ سکا کوئے یار کا
گذرے مری نگاہ سے دیر و حرم بہت

آر زیڈ، ۹۰۱بی، فلیٹ نمبر ۴۰۲، لین نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی، ۱۱۰۰۱۹۔

دعائے احسن

جناب محمد امین احسنؔ

تری محبت میں در بدر ہے اسے تو اپنی پناہ دے دے
ظلام دشت جنوں ہے گہرا اسے تو اپنی نگاہ دے دے

کہاں کا رستہ کہاں کا راہی نہ کوئی رشتہ رہا ہے باقی
جو جسم و جاں کا ملاپ کردے وہ ایک سچا گواہ دے دے

جھکائے سر کو ندامتوں سے تری ہی جانب رواں دواں ہے
ہے سیل رسم وفا شعاری اسے گذرنے کی راہ دے دے

بڑھی ہے ظلمت اسے گھٹا دے صحیح رستہ اسے دکھا دے
جو تیری دنیا میں معتبر ہے وہ اس کے دل کو کراہ دے دے

ہر ایک کوشش ہے بے نتیجہ دعاؤں میں بھی اثر نہیں ہے
جو سینہ گردوں کا چیر ڈالے وہ مرد مومن کی آہ دے دے

نئے زمانے میں بے اثر ہے وقار اس کا ذرا بڑھا دے
جو فتح و نصرت کی ہو ضمانت اسے بھی ایسی سپاہ دے دے

سکون و راحت کہیں نہیں ہے تمام دنیا دکھی دکھی ہے
ہو جس سے دنیا تمام روشن وہ نور انجم وہ ماہ دے دے

بدل گئی ہیں تمام قدریں نظام عالم بگڑ گیا ہے
دلوں سے نفرت کو جو مٹا دے وہ پیار الفت وہ چاہ دے دے

بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

مولانا ضیاء الدین اصلاحی، حیات و خدمات: مرتبہ جناب محمد طارق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۱۶، قیمت ۴۰۰؍ روپے، پتہ: شبلی چلڈرن اسکول، نظام آباد، آعظم گڑھ اوراعظم گڑھ کے دوسرے معروف مکتبے۔

زندگی بھی کیسے داستان میں بدل جاتی ہے، ابھی کل تک مولانا اصلاحی مرحوم سے دارالمصنّفین کی زندگی عبارت تھی، اب ان کی یادیں اور یادگاریں ہیں، مولانا مرحوم نے ۲۰۰۸ء میں وقت موعود کو لبیک کہا، ایک سال بعد ان کے لائق صاحبزادے نے مولانا مرحوم کی حیات و خدمات پر ایک سمینار کا اہتمام کیا، کئی عمدہ مقالات و مضامین پیش کیے گئے۔ ۲۰۱۳ء میں تمام مقالات کو یکجا کر کے جلوۂ صد رنگ، قرآنی خدمات، اردو زبان و ادب، تعلیم، تصانیف، شذرات نگاری، وفیات، تبصرہ، ترجمہ نگاری جیسے عنوانوں سے زیر نظر کتاب کی شکل میں شائع کر دیا گیا اور اب یہ مولانا اصلاحی کے علمی و عملی کمالات اور ان کی سادہ لیکن بڑی دلآویز شخصیت سے واقفیت کے لیے ایک عمدہ تحفہ ہے۔ مولانا پر آیندہ جو بھی کام ہوگا، یہ کتاب طلبہ و محققین کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔ ایک زمانہ کے بعد اس کتاب کے تعارف کی نوبت آئی، یہی کیا بے شمار کتابیں ہیں، سال پر سال گزرتے جاتے ہیں، ان کے تعارف میں کوتاہی ہی ہاتھ آتی ہے۔ معارف کے صفحات کی تنگ دامانی کا شکوہ یا پھر کچھ اور، مصنّفین و ناشرین سے بجز معذرت کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

سرگزشت عافیہ وامعتصماہ: از ڈاکٹر شاہد بدر فلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۷۶، قیمت ۱۳۰؍ روپے، پتہ: شعور حق، ایم ۲۱/ ۶/ ۷، جی ایف، نیر خلیل اللہ مسجد، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی ۔۲۵۔

اس کتاب کے مصنف کا زندانی ہونا اب محتاج بیان نہیں، لیکن ایک زندانی کو جمال یوسف سے حسن عمل کتنا ملا اس کے اظہار کے لیے وقت کے ساتھ دل و جگر کی ایک اور دنیا چاہیے، جہاں آنکھوں کے لیے لہوافشانی پر کوئی قدغن نہ ہو، ان کی ایک کتاب فلو العانی نے رلایا تھا اب یہ ایک مظلوم و مقہور و مجبور مسلمان خاتون کی وہ داستان الم ہے جس پر امت کو حق ہے کہ وہ آسمان کی جانب خشک آنکھوں اور کپکپاتی پلکوں سے فریاد کرے کہ متی نصر اللہ۔ عافیہ صدیقی، انسانیت کی تاریخ میں باطل کے جبر اور حق کی مجبوری سے زیادہ ان مسلم حکمرانوں کی بے غیرتی و بے حمیتی کی علامت ہے جنہوں نے وعدے وعید تو بہت کیے لیکن عملاً وہ صہیونیوں کے دریوزہ گر ہی رہے، ہمارے مورخوں نے خدا جانے کس ترنگ میں حجاج و معتصم جیسے حکمرانوں کے بارے میں روایات کا عجب پلندہ بکھیر دیا مگر حقیقت یہی ہے کہ فتح عموریہ جیسا تاریخی واقعہ ایک خاتون کی درد بھری پکار وامعتصماہ کی بازگشت ٹھہرا، دیبل کے داہر کی لوٹ سے واحجاجاہ کی ایک کراہ اٹھی اور حجاج کے دل سے ٹکرا کر سندھ کو ہمیشہ کے لیے باب الاسلام بنا گئی، یہ واقعات آج کے حکمرانوں کے ضمیر کو آواز دینے کے لیے اب بھی کارگر ہیں، مصنف کا مقصد بھی غالباً یہی ہے، باقی عافیہ کو جن عذابوں سے گزرنا پڑا اور آج بھی وہ ستم زدہ ہی ہے اس کی تفصیل بہر حال ایمان کو کمزور کرنے کی جگہ، امتحان میں عزیمت و استقلال ہی پیدا کرتی ہے۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کا تعارف اب اس کے دوسرے ایڈیشن کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ ع۔ص

رسید کتب موصولہ

۱۔ابجدِ عشق: مرزا اطہر ضیاء، ترتیب: عزیز نبیل، گرین پیجز، ۳۰/ اے، بھارت نگر، این، ایف، سی (N.F.C) نئی دہلی۔ قیمت: ۳۰۰/روپے

۲۔اقوال سلف (حصہ ششم): مولانا محمد قمرالزماں صاحب، مکتبہ دارالمعارف الہ آباد، ادارہ معارف مصلح الامت، الہ آباد۔ قیمت: درج نہیں ہے

۳۔بزم کہن (تذکرے اور خاکے): مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، ترتیب: محمد عرفات اعجاز اعظمی، شعبہ نشرواشاعت، مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ رگھولی، گھوسی، ضلع مئو یوپی۔

قیمت: ۲۵۰/روپے

۴۔تعلیمی زاویے: ڈاکٹر محمد خالد، الہدیٰ پبلی کیشنز، ۲۹۸۲، کوچہ نیل کنٹھ، دریا گنج، نئی دہلی۔

قیمت: ۳۰۰/روپے

۵۔سازِ نغمہ بار: شوکت پردیسی، ترتیب: ندیم احمد جونپوری، بلیک ورڈس پبلی کیشنز، ممبرا، تھانے، بھارت۔ قیمت: ۳۰۰/روپے

۶۔سرودرفتہ: جناب شاہد عمادی، ۳/ ۲، وکاس کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔ قیمت: ۲۰۰/روپے

۷۔ظفر اوگانوی: جناب دبیر احمد، مدیحہ پبلی کیشنز، ۴۴ بی، کارل مارکس سرانی، کولکاتا، ۷۰۰۰۲۳۔ قیمت: ۳۵۰/روپے

۸۔فکر وآگہی: ڈاکٹر سید ارشد اسلم، نیر مشن گراؤنڈ، آزاد بستی، رانچی ۸۳۴۰۰۱۔

قیمت: ۲۰۰/روپے

۹۔متاعِ فکر ونظر: جناب دبیر احمد، مدیحہ پبلی کیشنز، ۴۴ بی، کارل مارکس سرانی، کولکاتا، ۷۰۰۰۲۳۔ قیمت: ۳۰۰/روپے

۱۰۔محبت نامے: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، ۶۴۱ غلامی کا پورہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۳۰۰/روپے

دینی و عصری علوم کی اپنے طرز کی مشہور اقامتی (Residential) تعلیم گاہ

O100 سالہ خدمات O بہت سارے شعبہ جات O **تعلیمی مراحل** درجہ اطفال تا میٹرک (Metric) O شعبہ حفظ و ناظرہ: حفظ کے ساتھ ساتھ میٹرک O ہر سال بہار اسکول بورڈ کا امتحان سے امتیازی کامیابی O صد فیصد 100% رزلٹ O **فاصلاتی تعلیم** (Distance Education) I.A, B.A. M.A. اور لائبریری سائنس (B.Lib) میں 18-2017 کے سیشن کے لئے داخلہ جاری (اسٹڈی سنٹر: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے منظور شدہ) O کمپیوٹر (Computer) کی بھی تعلیم O **کفالہ اسکیم** کے تحت ایک یتیم طالب علم پر سالانہ خرچ اٹھارہ ہزار (18000/=) روپے O750 **یتیم طلباء** جن کا سارا خرچ ادارہ ہی برداشت کرتا ہے O سالانہ خرچ 25 لاکھ روپے سے زائد O **ذریعہ آمدنی** مسلم عوام کے چندے O آپ جس شکل میں ممکن ہو تعاون فرما کر اللہ تعالی سے اجر عظیم حاصل کریں O **تعاون کی شکلیں**: مثلاً زکوٰۃ O عطیات O صدقات O پیداوار کی زکوٰۃ O چرم قربانی O ایک یتیم بچے کا سالانہ خرچ O بینک (Bank) کے سود (Interest) کی وہ رقم جو مسلمانوں کے لئے حرام ہے، غریب یتیم طلباء کی جہالت دور کرنے اور تعلیم پھیلانے کے لئے لڑکوں کے دارالایتامی فنڈ میں دیں۔ اپنے یا کسی بزرگ کے نام کمرہ یا ہال بنوانا وغیرہ۔ **یاد رکھیں** یہاں ہر سال آڈٹ (Audit) بھی کرایا جاتا ہے۔ آپ ادارہ میں پہنچ کر مساوات کا مثالی اور عملی نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ کس طرح یتیم بچے پل کر رہا کرتے ہیں۔ **نوٹ** (۱) عنایت ٹیکنیکل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (Enayath Technical Training Institute) کی تعمیر عمارت کا کام مکمل ہے اور تعلیمی سلسلے کا آغاز جلد ہی ہونے والا ہے (۲) پُر فضا مقام پر پُرسکون ماحول / اسلامی لباس / اسلامی یونیفارم اور اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ کم خرچ میں بہار بورڈ کے نصاب کے ساتھ معیاری تعلیم (۳) یتیم طلباء جن کے والد کا انتقال ہو چکا ہے ان کے قیام و طعام کے ساتھ ساتھ ایک بیٹے کی طرح یہاں ساری سہولت بالکل مفت دی جاتی ہے (۴) بیرونی طلباء کے لئے اپنے خرچ پر ہاسٹل کا بھی نظم ہے (۵) قوم کے معزز حضرات سے گزارش ہے کہ قوم کے یتیم بچوں کو ادارہ میں داخل کرانے کے لئے زحمت کریں اور توجہ دلائیں۔

ادارہ آپ سے فراخدلانہ تعاون کی اپیل کرتا ہے۔

یہ ادارہ غیر ملکی زر کے قانون FCRA کے تحت بھی رجسٹرڈ ہے۔

(Foreign Donors) غیر ملکی چندہ دہندگان

O Bank A/C No: 300402010000187

O Bank Swift Code : UBININBBJAM or IFS Code No: UBIN 0530042

O Bank : **UNION BANK OF INDIA (MAIN BRANCH, GAYA)**

نوٹ: باہر ملک کے حضرات اوپر لکھے ہوئے اکاؤنٹ نمبر اپنی رقم ڈالر، ریال اور پونڈ وغیرہ میں بھی بھیج سکتے ہیں۔

چیک و ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں: **"THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE"**

برائے رابطہ (خط، چیک و ڈرافٹ اور منی آرڈر بھیجنے کا پتہ)

Hon. SECRETARY, THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE
At+P.O. CHERKI - 82437, Distt: GAYA (BIHAR) INDIA

(Indian Donors) ہندوستانی چندہ دہندگان

O CORE BANKING A/C No: 300402010010581

O Bank IFS CodeL UBIN 0530042

O Bank : UNION BANK OF INDIA (MAIN BRANCH, GAYA)

نوٹ: ہندوستانی صوبوں میں رہنے والے حضرات ہندوستانی چندہ دہندگان والے اکاؤنٹ نمبر پر اپنی رقم بھیجیں۔

Mobile: 09801213022, 09805655960 Email: gmocde@yahoo.co.in

Old Boys Association : website: www.gmogaya.org

نوٹ: Documentary Film- Nazr-e-Enayat جس میں دونوں یتیم خانہ کی مختصر تاریخ ہے۔ انٹرنیٹ You-Tube پر دیکھیں۔

نوٹ: کور بینکنگ اور Online والے حضرات Email یا ڈاک سے مکمل پتہ بھیج دیا کریں تا کہ اسی پتے پر رقم کی رسید روانہ کی جا سکے۔

یاد رکھیں: یتیم خانہ نے اپنی زندگی کے سو سال (100Years) مکمل کر لئے ہیں۔ اس لئے اکتوبر ۲۰۱۷ء میں یتیم خانہ میں سو سالہ صدی کا جشن بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ منایا جائے گا۔

صدر: ڈاکٹر فراست حسین **اعزازی ناظم: ڈاکٹر محمد احتشام رسول**

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	180/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
June 2017 Vol - 199 (6)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

تصانیف ومطبوعات شبلی صدی تقریبات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی (جدید)	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-